الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دنیا کی اکثر برائیاں حسد سے پیدا ہوتی ہیں
اور دنیا کی اکثر اچھائیاں فیاضی سے

فروری ۱۹۹۱
شمارہ ۱۷۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۱ — شمارہ ۱۷۱

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 ELSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

اسلامی جہاد

جہاد کے لفظی معنی کوشش (struggle) کے ہیں۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم شامل ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں جہدتُ رائی۔ یعنی میں نے اس معاملہ میں بہت زیادہ غور و فکر کیا۔ قرآن میں ہے کہ واقسموا باللہ جہد ایمانہم (المائدہ ۵۳) یعنی قسم کھانے میں شدت برتنا، مبالغہ کرنا۔

اسلام شروع سے آخر تک جہاد ہے۔ آدمی جب اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک مجاہدانہ زندگی میں داخل ہوتا ہے جو برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی راہ میں آدمی کی موت آجائے۔

اس جہاد کا پہلا محاذ آدمی کی خود اپنی ذات ہے۔ جب آدمی اپنے آپ کو مومن و مسلم کہتا ہے تو وہ گویا یہ عہد کرتا ہے کہ وہ نفسیاتی محرکات کو دبائے گا اور شیطانی ترغیبوں سے لڑکر خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے گا۔ اس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کے لیے اپنی نفس سے جہاد کرے (المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله)

جہاد کا دوسرا محاذ دعوت ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہونچانے کے لیے اپنی ساری ممکن کوشش صرف کرنا۔ یہ اتنا بڑا عمل ہے کہ قرآن میں اس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے (وجاهدهم به جهاداً كبيراً) اللہ کے دین کا خطاب تمام انسانوں اور تمام قوموں سے ہے۔ اس کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ سارے اہل عالم تک پہونچانا ہے۔ اس لحاظ سے بلاشبہ دعوت کا عمل عظیم ترین جہاد ہے، اس سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں۔

جہاد کا تیسرا محاذ دفاع ہے۔ یعنی اسلام کے دشمن اگر یک طرفہ طور پر اہل اسلام کے اوپر جارحانہ حملہ کر دیں، اور ان کو حملہ سے باز رکھنے کی تمام ممکن تدبیریں غیر موثر ثابت ہوئی ہوں تو ایسی صورت میں بشرط استطاعت ان سے مقابلہ کرکے انھیں پسپا کرنا اور ان کے حملہ کو ناکام بنادینا، جہاد کی یہی تیسری قسم ہے جس کو شریعت میں قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

جہاد نفس اور جہاد دعوت ایک مستقل عمل ہے، وہ مومن کی زندگی میں ہر روز اور ہر لمحہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جہاد اعداء ایک اتفاقی اور استثنائی عمل ہے۔ اس کا مقصد دفاع ہے اور دفاع اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی کی طرف سے جارحیت کا آغاز کر دیا جائے۔

شیر دیکھ رہا ہے

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۹۰۷ میں ہندستان آیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ کمایوں (یوپی) کے جنگلوں میں بہت سے مردم خور شیر ہیں، وہ اپنی رائفل لے کر کمایوں کے جنگل میں پہونچ گیا۔ ۱۹۰۷ میں اس نے پہلے مردم خور شیر کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا جو ۴۳۰ آدمیوں کو مار کر کھا چکا تھا۔

جم کاربٹ نے کمایوں کے جنگلوں میں ۲۲ سال گزارے۔ اس نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ایک درجن سے زیادہ مردم خور شیروں کو ہلاک کیا۔ اس جان جوکھم کام کا واحد انعام، جم کاربٹ کی یہ روحانی تسکین تھی کہ وہ زمین کے ایک چھوٹے سے حصہ کو اس قابل بنانے کہ ایک لڑکی محفوظ طور پر وہاں چل سکے:

Satisfaction at having made a small portion of the earth safe for a girl to walk on.

جم کاربٹ نے اپنی کتاب کمایوں کے مردم خور شیر (Man-eaters of Kumaon) میں اپنے ان تجربات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو مردم خور شیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے پیش آئے۔ ایک موقع پر اس نے لکھا ہے کہ دن کی روشنی میں بھی شیر کی قربت، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ اس نے آپ کو دیکھا نہ ہو، خون کی گردش میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ پھر جب شیر ایک عام شیر نہ ہو، بلکہ وہ مردم خور شیر ہو، تاریک رات کے ۱۰ بجے ہوں، اور آپ جانتے ہوں کہ مردم خور شیر آپ کو دیکھ رہا ہے، اس وقت خون کی گردش ایک طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہے:

The near proximity of a tiger in daylight, even when it has not seen you, causes a disturbance in the bloodstream. When the tiger is not an ordinary one, however, but a man-eater and the time is ten o'clock on a dark night, and you know the man-eater is watching you, the disturbance in the blood becomes a storm.

یہ احساس کہ شیر میرے قریب ہے اور وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، آدمی کے خون میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔ پھر اس انسان کا کیا حال ہوگا جس کے اندر یہ یقین آجائے کہ وہ خدا جو تمام شیروں کا اور تمام زمین و آسمان کا خالق ہے، وہ میرے قریب ہے اور مجھ کو اس طرح دیکھ رہا ہے کہ میری کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

نبیٔ رحمت کا طریقہ

فتح مکہ کے بعد مکہ کی بہت سی عورتوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اسلام قبول کیا۔ انھیں میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی۔ یہ وہی عورت ہے جس نے احد کی جنگ میں حضرت حمزہ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ وہ کئی عورتوں کے ساتھ آئی۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے محمدؐ کے سامنے کلام کیا تو وہ پہچان لیں گے، اور اگر انھوں نے پہچان لیا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے (فقالت إنّی إن اتکلم یعرفنی وان عرفنی قتلنی)۔

چنانچہ بیعت کے وقت ہند نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ مگر وہ اونچے خاندان کی عورت تھی، اس لیے وہ اپنی بڑائی کے احساس سے چپ نہ رہ سکی۔ بیعت کے الفاظ ادا کراتے ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا کہ یوں کہو کہ ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے (ولا نقتل اولادنا) تو ہند نے بے برداشت ہو کر گستاخی کے الفاظ کہے۔ اس کے الفاظ مختلف روایتوں میں اس طرح نقل کیے گئے ہیں:

قالت هند انت قتلتهم يوم بدر فانت وهم ابصر	ہند نے کہا کہ آپ نے ان کو بدر کے دن قتل کر دیا اس لیے آپ جانیں اور وہ جانیں۔
ربيناهم صغاراً فقتلتوهم كباراً	ہم نے چھوٹے پر انھیں پالا اور بڑے پر آپ نے انھیں قتل کر دیا۔
تقتل آباءهم وتوصينا باولادهم	آپ خود تو ان کے باپوں کو قتل کرتے ہیں اور ہم کو ان کی اولاد کے بارہ میں نصیحت کر رہے ہیں۔

ہند نے اس سے پہلے بھی بار بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مذکورہ واقعہ میں تو اس نے رو در رو توہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم رہنماؤں نے جو خود ساختہ اسلام وضع کر رکھا ہے، یہی اسلام اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ہوتا تو آپ فوراً ہند کو قتل کرا دیتے۔ مگر آپ نے بیعت لے کر ہند کو اسلام میں داخل کر لیا۔

آج مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو کھوئی گئی ہے وہ نبی رحمت کا یہی طریقہ ہے۔

تنقید واختلاف

ابن قیم الجوزیہ ۶۹۱ ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ۷۵۱ ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی ایک مشہور کتاب اعلام الموقعین ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان ۱۰۰ مسائل میں باہم اختلاف تھا۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے صحابہ کے درمیان رایوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

ولم یستنکر احد هذا الخلاف۔ انما اعتبره الجمیع امرا طبیعیا لا یقطع ودّاً ولا یفرق صفاً۔

اور کسی نے بھی اس اختلاف کو برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا۔ جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوتا۔

یہ اسلام کی وہ صورت حال ہے جو اصحاب رسول کے زمانہ میں تھی۔ یعنی وہ زمانہ جس کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان آزادانہ طور پر اختلاف رائے کرتا تھا۔ یہ اختلاف رائے اکثر نہایت شدید الفاظ میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اختلاف اور تنقید کرنے والے کو روکا جائے یا اس کو کوئی ناپسندیدہ کام سمجھا جائے۔

اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ آج اگر کسی مسلم شخصیت پر تنقید کر دی جائے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دور صحابہ اور موجودہ زمانہ میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ صرف ایک اللہ کو بڑا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ کے بعد تمام انسان ان کی نظر میں برابر تھے۔ اس لیے انسانوں پر تنقید سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی بڑا بنائے ہوئے ہیں۔ ان انسانی بڑوں کے لیے انھوں نے مبتدعانہ طور پر "اکابر" کا لفظ وضع کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

دین میں معیار بہر حال اصحاب رسول ہیں۔ مسلمان اگر اس کے سوا کوئی اور معیار بنائیں تو وہ بلاشبہ بدعت ہے، اور بدعت اسلام میں مقبول نہیں۔

ایک تاریخ

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر جب ان کا خاندان مصر گیا تو افراد خاندان کی کل تعداد ۶۷ تھی ۔ (اس تعداد میں وہ لڑکیاں شمار نہیں کی گئی تھیں جو حضرت یعقوب کے گھرانے میں بیاہی ہوئی آئی تھیں) حضرت یوسف کی وفات کے تقریباً پانچ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے ۔ ان کے ساتھ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے ۔ بائبل کے بیان کے مطابق خروج کے بعد دوسرے سال بیابان سینا میں حضرت موسیٰ نے جو مردم شماری کرائی تھی ، اس کے مطابق صرف قابل جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت ، مرد ، بچے ، بوڑھے سب ملاکر وہ کم ازکم ۲۰ لاکھ ہوں گے ۔

ظاہر ہے کہ ۶۷ افراد کے ایک خاندان کی تعداد پانچ سو سال میں محض توالد وتناسل سے اتنی زیادہ نہیں ہوسکتی ۔ تعداد میں اس غیر معمولی اضافہ کا سبب یقیناً بنی اسرائیل کی تبلیغ تھی ۔ ان کی تبلیغ کے زیر اثر جن مصریوں نے اپنا دین بدلا ، غالباً ان کا تمدن بھی بنی اسرائیل کے رنگ میں رنگ گیا تھا ۔ بائبل میں ان نومسلموں کے لیے " ملی جلی بھیڑ " جیسے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں ۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کے یہ دینی بھائی بھی ان کے ساتھ تھے ۔

بنی اسرائیل کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مصر میں مکمل طور پر مغلوب اور محکوم حالت میں تھے ۔ مصری ان کو غلام اور مزدور کے درجہ میں رکھ کر ان سے خدمت لیتے تھے ۔ قبطی قوم کی حیثیت معزز قوم کی تھی ۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کی حیثیت حقیر اور ناقابل ذکر قوم کی ۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل کے دین نے بہت سے قبطیوں کو متاثر کیا ۔ وہ فرعون کا مذہب چھوڑ کر موسیٰ کے مذہب میں داخل ہوگیے ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین حق تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت ہے ۔ دین حق وہاں بھی لوگوں کو مسخر کرلیتا ہے جہاں بظاہر اس کا امکان دکھائی نہ دیتا ہو کہ وہ لوگوں کو مسخر کرسکتا ہے ۔

خدا کے دین کی طلب خود انسانی فطرت کے اندر موجود ہے اور یہی اس کی اصل طاقت ہے ۔ خدا کا دین خود اپنی طاقت کے زور پر لوگوں کے سینہ میں داخل ہوتا ہے نہ کہ اہل دین کی قومی یا مادی طاقت کے زور پر ۔

ایک حدیث

حدیث کی کتابوں میں دور آخر کے بارہ میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے:

عن المقداد انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول، لا يبقى على ظهر الارض بيتُ مَدَرٍ ولا وَبَرٍ الّا ادخله الله كلمةَ الاسلام بعزّ عزيز وذُلّ ذليل اما يُعِزّهم اللهُ فيجعلهم من اهلها اويُذلّهم فيدينون لها

(مشکاۃ المصابیح، الجزء الاول، صفحہ ۲۰)

حضرت مقداد کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی خیمہ یا گھر باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ اللہ اس میں اسلام کے کلمہ کو داخل کر دے گا، خواہ عزیز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اللہ یا تو انھیں عزت دے گا اور ان کو اہلِ اسلام میں سے بنا دے گا یا انھیں ذلیل کرے گا تو وہ اس کے دین کو اختیار کر لیں گے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آخری زمانہ میں اسلام ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔ مگر حدیث کے الفاظ کے مطابق، جو چیز گھروں کے اندر داخل ہوگی وہ اسلام کا کلمہ ہوگا نہ کہ اسلام کا سیاسی اور حکومتی اقتدار۔ کچھ لوگوں نے اس پیشین گوئی کو سیاسی داخلہ کے معنی میں لے لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ساری دنیا میں اسلام کا سیاسی جھنڈا لہرانے کے نام پر مدعو اقوام سے سیاسی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس بے معنی لڑائی کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام سے بیزار ہو کر اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس پیشین گوئی کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ توحید اور آخرت کے ربانی پیغام سے تمام قوموں کو باخبر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں، وہ اسلام کو فکری حیثیت سے ایک معلوم اور مسلّم چیز بنا دیں، تاکہ جس کو ماننا ہے وہ مانے، اور جس کو نہیں ماننا ہے اس پر حجت قائم ہو جائے۔

عمل تبلیغ کی انتہا اتمامِ حجت ہے نہ کہ قیامِ حکومت۔

پیغمبر کی پیشین گوئی

عن مرداس الاسلمی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذہب الصالحون الاول فالاول وتبقی حثالۃ کحثالۃ الشعیر اوالتمر لایبالیہم اللہ بالۃ (رواہ البخاری)

مرداس اسلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صالح لوگ چلے جائیں گے، ایک کے بعد ایک۔ اور پھر بھس رہ جائے گا، جیسے جَو یا کھجور کا بھس ہوتا ہے۔ اللہ کو ان کی کچھ پروا نہ ہوگی۔

اس حدیث میں ذہاب کا مطلب موت نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے صالح افراد مرجائیں گے اور غیر صالح افراد زندہ رکھے جائیں گے۔ کیوں کہ موت تو سب کے اوپر یکساں طور پر آتی ہے۔ وہ صالح اور غیر صالح کے درمیان فرق نہیں کرتی۔

اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلامی اداروں اور اسلامی حلقوں کا یہ حال ہو جائے گا کہ وہاں عمومی طور پر وہ لوگ جمع ہوں گے جو پست ذوق اور معمولی صلاحیت والے ہیں۔ بلند صلاحیت والے اور اعلیٰ ذوق کے لوگ دینی شعبوں میں آنا کم ہو جائیں گے۔

خدا کا دین ایک ہی دین ہے۔ مگر نمائندگی کے اعتبار سے اس میں فرق ہو جاتا ہے۔ دین کی نمائندگی جب اعلیٰ سطح پر ہو تو اعلیٰ درجہ کے افراد اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اور جب دین کی نمائندگی پست سطح پر ہونے لگے تو پست درجہ کے لوگ ہی اس کی طرف آتے ہیں۔

اداروں اور تحریکوں میں اگر اعلیٰ معیار کی تقریر اور تحریر کے ذریعہ دین کو پیش کیا جارہا ہو تو اعلیٰ سطح کے افراد اس کی طرف کھنچیں گے۔ ان سے جس کردار کا مظاہرہ ہوگا وہ بھی اعلیٰ اور ارفع کردار ہوگا۔ اور جب دین پیش کرنے والوں کے یہاں تقریر و تحریر اور اخلاق و کردار کا معیار پست ہو جائے تو اسی درجہ کے لوگ دینی حلقوں میں جمع ہوں گے جو دین کی نمائندگی کرنے والوں کا درجہ ہے۔

"اللہ کو ان کی پروا نہ ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ دین کا کوئی بڑا کام نہیں انجام پاسکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے بڑا دل اور اعلیٰ صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اور یہ چیزیں ان کے یہاں موجود نہ ہوں گی۔ ایسی حالت میں اس قسم کے لوگ کوئی بڑا دینی کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

بے مُلک

علی زکریا الانصاری (۶۰ سال) ہندستان میں کویت کے سفیر ہیں۔ انھوں نے انگلش میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ کئی ملک میں کویت کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اچانک انھوں نے یہ خبر سنی کہ عراق نے اپنی طاقتور فوج کویت میں داخل کر دی اور کویت پر قبضہ کر کے اس کو عراق میں شامل کر لیا۔ ان کی بیوی اور دو بچے کویت میں ہیں اور وہ خود نئی دہلی میں۔ مواصلاتی سلسلہ منقطع ہونے کی بنا پر وہ اپنے گھر والوں کے بارہ میں بالکل بے خبر ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ اگست ۱۹۹۰) کا نمائندہ راج گھٹا (Chidanand Rajghatta) نے علی زکریا الانصاری سے نئی دہلی میں ان کی محل نما رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ رپورٹر کے الفاظ میں مسٹر الانصاری سخت پریشانی کے عالم میں تھے، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب وہ ایک غیر موجود ملک کے سفیر (Envoy of a non-existent country) بن کر رہ گئے ہیں۔

ان کے ملک کے خلاف طاقت ور عراق کی اچانک جارحیت کے بعد، ۶۰ سالہ سفیر ابھی تک اس صدمہ سے باہر نہیں آسکے ہیں جو انھیں ایک رات کے اندر اپنے ملک کو کھو دینے کی بنا پر پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شام کو ان کا ملک موجود تھا اور اگلے دن وہ نہ رہا:

More than a week after mighty Iraq's sudden aggression against his country, the 60-year old envoy is yet to overcome the shock and trauma of losing his country overnight. One evening it was there and on the morrow....gone (p.20).

موت سے پہلے اس دنیا کا ہر آدمی ملک والا بنا رہتا ہے، مگر موت کے بعد ہر آدمی بے ملک بن جاتا ہے۔ یہ تجربہ آخر کار ہر آدمی پر گزرنے والا ہے، کسی وقتی مدت کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے۔ عقل مند وہ ہے جو موت سے پہلے موت کے بعد والے حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لے۔ جو دوسروں کو بے ملک ہوتے دیکھ کر یہ جان لے کہ اسی طرح ایک روز میرا ملک بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔

آج کے بعد کل

بے نظیر بھٹو ۲۰ مہینے تک پاکستان کی وزیر اعظم رہیں۔ اس کے بعد ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق خاں نے پاکستانی فوج کی مدد سے انھیں وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے زمانہ میں بدعنوانیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اخبارات میں اس سلسلہ میں بہت سے قصے نقل کیے گئے ہیں۔ ہندستان ٹائمس (۲۲ اگست ۱۹۹۰) نے اپنے لاہور کے نامہ نگار ایس وینکٹ نرائن کی ایک مفصل رپورٹ شائع کیا ہے۔ اس میں مختلف واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے رشتہ داروں اور ان کی پارٹی کے ممبروں نے ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں مجموعی طور پر اربوں روپیہ نقد یا جائداد کی صورت میں حاصل کیا۔

نامہ نگار نے لکھا ہے کہ خاتون وزیر اعظم کے دوست اور رشتہ دار اور اسی کے ساتھ ان کے نزاعی شوہر آصف علی زرداری کے دوست اور رشتہ دار اپنے آپ کو دولت مند بنانے میں اس طرح مصروف تھے گویا کہ ان کے لیے کبھی کل نہیں آئے گا :

Friends and relatives of the lady's and those of her controversial husband, Mr Asif Ali Zardari, were busy enriching themselves as though there would be no tomorrow (p. 12).

انگریزی اخبار کے نامہ نگار نے جو بات بے نظیر بھٹو کے بارہ میں لکھی، وہی آخرت کے اعتبار سے تمام دنیا کے انسانوں کا معاملہ ہے۔ موجودہ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اپنے "آج" میں مشغول ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کا کوئی "کل" یا کوئی "۶ اگست" آنے والا نہیں۔

لوگ حق کا انکار کر رہے ہیں گویا کہ ان سے پوچھا جانے والا نہیں کہ انھوں نے کیوں حق کا انکار کیا۔ لوگ جھوٹے الفاظ بولنے میں مشغول ہیں گویا کہ ان کے بولے ہوئے الفاظ پر ان کی کوئی پکڑ ہونے والی نہیں۔ لوگوں نے دوسروں کے جان اور مال اور آبرو کو اپنے لیے حلال کر رکھا ہے گویا کہ ان سے اس کا حساب نہیں لیا جائے گا کہ انھوں نے کیوں خدا کے حرام کیے ہوئے کو اپنے لیے حلال کر لیا۔ لوگ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے اصولوں کو توڑ رہے ہیں گویا کہ ان پر وہ دن آنے والا نہیں جب انھیں یہ بتانا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے وقتی فائدے کے لیے خدا کے ابدی اصولوں کو کیوں توڑ دیا۔

دھاندلی

عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۱۶۸۸۶۸ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مدوں میں خرچ کر کے ۱۰ لاکھ کی طاقت ور فوج بنالی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کر دی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے"۔

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کر لیا گیا۔ عراق کی ۹۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہو گئے۔ زرعی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔ اب عراق کے حکمراں صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۳ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارہ میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُرجوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے:

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹ واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی میں مبتلا ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ اُسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو اُن الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اعلیٰ مقصد

ایک عرب ملک کی ٹیم بمبئی آئی اور ایک ہوٹل میں ٹھہری۔ ان کو اپنے ملک کے لیے کچھ کارکنوں کی ضرورت تھی۔ انھوں نے انگریزی اخبارات میں اشتہار چھپوایا۔ اس کو دیکھ کر دہلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان نے بھی اپنے کاغذات انھیں بھیجے۔ اس کے جواب میں اس کے پاس بمبئی سے انٹرویو کارڈ آگیا۔ مذکورہ نوجوان رکشہ پر بیٹھ کر اپنے گھر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو اس کو چھوڑنے کے لیے اسٹیشن تک جارہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ کچھ جاہل قسم کے لڑکے کھیل رہے تھے۔ رکشہ ان کے پاس سے گزرا تو ایک لڑکے نے ان کے خلاف برے الفاظ کہے۔ دوسرے نے کنکر پھینک دیا۔ اب نوجوان کے ساتھی کو غصہ آگیا۔ اس نے چاہا کہ رکشہ روک کر اترے اور لڑکوں کو مارے۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا: چھوڑو ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے ایک منزل تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وقت پر اسٹیشن پہونچ کر ٹرین پکڑے۔ بمبئی جاکر انٹرویو دے اور پھر عرب پہونچ کر دس ہزار روپیہ مہینہ کمائے۔ اس مقصد نے اس کی نظر میں لڑکوں کی گالی یا ان کی کنکری کو حقیر بنادیا۔ وہ ان کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ گیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل اسلام کا ہے۔ اہل اسلام وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہوں۔ دعوت کا اعلیٰ تصور ان کی نظر میں بقیہ تمام چیزوں کو ہیچ کردیتا ہے۔ وہ لوگوں کی طرف سے برے الفاظ سنتے ہیں، ان کی طرف پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ مگر وہ ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے کہ ہم اس قسم کی چھوٹی چیزوں میں الجھیں۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے صرف دس ہزار روپیہ مہینہ کی منزل تھی۔ مگر داعی اور مومن کے سامنے جنت کی منزل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے خدا کا یہ وعدہ ہوتا ہے کہ اس کا جو بندہ اس کے پیغام کو انسانوں تک پہونچائے گا اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور دل آزاری کو برداشت کرے گا، اس کے لیے آخرت میں ابدی جنت ہے۔ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ صبر ہی تو جنت کی قیمت ہے۔ پھر اگر میں لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر نہ کروں تو آخرت میں مجھے جنت کا داخلہ کس طرح ملے گا۔

اعراض میں دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اسی میں آخرت کی کامیابی بھی۔

جدید سائنس

رابرٹ بائل (Robert Boyle) مشہور سائنس داں ہے۔ وہ ۱۶۲۷ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۹۱ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سائنس کے مطالعہ کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر سائنس کے مطالعہ نے اس کو مذہب سے دور نہیں کیا۔ بلکہ اور قریب کر دیا۔ آخر میں وہ پختہ قسم کا پروٹسٹنٹ عیسائی بن گیا۔ اس نے شادی نہیں کی اور اپنی تمام کمائی مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

رابرٹ بائل خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق، فطرت کا نظام ایک گھڑی کی مانند ہے۔ خدا نے اس کو پیدا کیا اور اس کو ابتدائی طور پر چلا دیا۔ اب وہ ثانوی قانون کے تحت عمل کر رہی ہے۔ جس کا سائنس کے ذریعہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

> In his view of divine providence, nature was a clocklike mechanism that had been made and set in motion by the Creator at the beginning and now functioned according to secondary laws, which could be studied by science (3/97).

یہ بیسویں صدی سے پہلے کی سائنس تھی۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں یکسانیت (uniformity) ہے۔ کائنات کے تمام اجزا ریکساں قوانین کے تحت چل رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں پہونچ کر یہ نظریہ باقی نہ رہ سکا۔

کائنات کبیر (macrocosm) کے مطالعہ میں بظاہر یہ دکھائی دیا تھا کہ کائنات میں یکسانیت کی کارفرمائی ہے۔ مگر کائنات صغیر (microcosm) کے مطالعہ نے اس مفروضہ کو رد کر دیا۔ شمسی نظام کی سطح پر انسان کو جو یکسانیت نظر آتی تھی وہ ایٹم کی سطح پر پہونچ کر ٹوٹ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کو خدا ہی نے اپنے حکم سے بنایا ہے۔ اور وہی اپنے حکم سے اس کو چلا رہا ہے۔ نہ کائنات کو بنانے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کائنات کو چلانے میں کوئی اس کا شریک۔ ایک خدا کو چھوڑ کر جو نظریہ بھی کائنات کی توجیہہ کے لیے بنایا جاتا ہے وہ بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک خدا کی توجیہہ ہی صحیح توجیہہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری توجیہہ صرف انسان کا ذہنی مفروضہ ہے، اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔

غیر مؤثر

آسٹریلیا کے ایک صحافی مسٹر ہارڈنگ (Mervyn Hardinge) کا ایک مضمون پرتھ (Perth) میں چھپا۔ اس کا موضوع آسٹریلیا میں شراب نوشی کا مسئلہ (drink problem) تھا۔ اس مضمون کو دوبارہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے اپنے شمارہ ۶ اگست ۱۹۹۰ (صفحہ ۹) میں نقل کیا ہے۔

مضمون نگار نے آسٹریلیا کے ہیلتھ سروسز کے منسٹر مسٹر اسٹیپلس (Mr Staples) کے ایک بیان کے حوالے سے بتایا ہے کہ آسٹریلیا کے لوگ سالانہ پانچ بلین ڈالر شراب پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں سڑک کے حادثات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں، آسٹریلیا کے ہر دس آدمی میں سے ایک آدمی کو شراب سے تعلق رکھنے والے دماغی مرض (alcohol-related brain damage) میں مبتلا پایا گیا ہے۔ شراب کے خلاف اشتہار، شراب کے ٹیکس میں اضافہ وغیرہ شراب نوشی کو روکنے یا کمی کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

آسٹریلیا کے کچھ دانشوروں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس مسئلہ کو تعلیم کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اس قسم کی کوشش مفید ثابت نہ ہوگی۔ کوئی بھی شراب مخالف تعلیمی پروگرام ناگزیر طور پر ناکام ہو جائے گا، اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہوگی کہ جن طلبہ کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے، ان کی بیشتر تعداد اتنی مخمور ہوگی کہ وہ کلاس میں حاضر ہی نہ ہوگی:

Any anti-liquour education programme must inevitably fail for the simple reason that most of the prospective pupils would usually be too fuddled to attend class.

یہ بات جو یہاں شراب مخالف تعلیم کے بارہ میں کہی گئی ہے، وہی اس قسم کی اکثر کوششوں کے بارہ میں صحیح ہے۔ مثلاً پاکستان میں "اسلامائزیشن" کی اسکیم کے تحت ٹیلی وزن پر اسلامی پروگرام جاری کیے گئے۔ مگر ان کو صرف وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں، اور جن کو دیکھنا چاہیے، ان کا حال یہ تھا کہ جیسے ہی اسلامی پروگرام شروع ہوا، انھوں نے ٹی وی سٹ کو بند کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی فکری اصلاح ہمیشہ تبلیغی مہم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ وہ اسکول کی تعلیم یا ٹی وی کے پروگرام کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

احتساب غیر

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) نے ایک بار بتایا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وائس چانسلر بن کر آئے تو یونیورسٹی کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یونیورسٹی میں کئی اسٹاف ممبر رجعت پسند اور فرقہ پرست ہیں۔ ان کی وجہ سے یونیورسٹی بدنام اور تباہ ہو رہی ہے۔ اگر ان سب لوگوں کو نکال دیا جائے تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل درست ہو جائے گی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ ایسے لوگوں کی فہرست بنا کر مجھے دیدیجئے۔

پھر کچھ دوسرے لوگ ذاکر صاحب سے ملے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ یونیورسٹی کے کئی استاد کمیونسٹ اور دہریہ ہیں۔ ان کو آپ یہاں سے نکال دیں تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل صحیح ہو جائے گی۔ ذاکر صاحب نے ان سے بھی کہا کہ آپ مذکورہ افراد کی فہرست بنا کر مجھے دیدیں۔

دونوں صاحبان کی طرف سے فہرستیں بن کر آگئیں۔ اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سو آدمیوں کا ٹیچنگ اسٹاف تھا۔ جب کہ دونوں فہرستوں میں دو دو سو نام درج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا: "میں حیران ہوں کہ آخر تین سو آدمیوں میں سے چار سو آدمیوں کو کیسے نکال دوں"

دونوں فہرستوں کو ملا کر جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس نام ایسے ہیں جو دونوں فہرستوں میں مشترک طور پر موجود ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ بتائیے، اگر میں ان سب کو نکال دوں تو پھر یونیورسٹی میں کون رہ جائے گا جو یہاں بچوں کو پڑھائے (الجمعیتہ، دہلی، ۲۸ جون ۱۹۸۰)

یہ واقعہ قوم کی اخلاقی حالت کو بتا رہا ہے۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک دوسروں کے بارہ میں سوچنے کا بادشاہ ہے۔ کوئی شخص اپنے بارہ میں سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک کے پاس بیرونی غلط کاروں کی لمبی لمبی فہرستیں ہیں۔ مگر خود اپنی غلط کاری کی فہرست کسی کے پاس بھی نہیں۔

کسی قوم کے افراد میں احتساب خویش کا مزاج ہو تو اس کے تمام معاملات درست رہتے ہیں۔ اور جس قوم کے افراد میں احتساب غیر کا مزاج پیدا ہو جائے، اس کے تمام معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ احتساب خویش کے مزاج سے دنیا بھی درست ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ احتساب غیر کا مزاج دنیا کو بھی بگاڑ دیتا ہے اور آخرت کو بھی۔

اتحاد کی اہمیت

حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو ہو تو اپنی صفوں کو درست کرو اور خلل کو اچھی طرح پُر کرلو (اذا قمتم فاعدلوا صفوفکم وسدوا الفرج)

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ جس شخص نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے اور جس شخص نے صف کو کاٹا اللہ اسے کاٹ دے (من وصل صفاً وصله الله ومن قطع صفاً قطعه الله)

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں اپنی صفوں کو اچھی طرح پر کرو اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ گردنوں کو برابر رکھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ صفوں کے خلل سے بکری کے بچہ کی طرح داخل ہورہا ہے (رصّوا صفوفکم وقاربوا بینها وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیده انی لاری الشیطان یدخل من خلل الصف کانها الحذف) ابو داؤد، نسائی

اس طرح کی بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جن میں یہ تاکید ہے کہ جب نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہو تو خوب مل کر صف بندی کرو۔ کچھ روایتوں میں یہ بھی ہے کہ دو نمازیوں کے بیچ میں اگر خلل رہے گا تو وہاں سے شیطان داخل ہو جائے گا۔ کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنوں میں لے لیا۔ حالاں کہ اگر اس کو بالکل لفظی معنوں میں لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قابل عمل ہی نہیں۔ کیوں کہ دو نمازی جب اپنے پیروں کو پھیلا کر ایک دوسرے سے ملاتے ہیں تو خود ایک نمازی کے اپنے دو پیروں کے درمیان اتنا خلل ہو جاتا ہے جو "بکری کے بچہ" کے داخل ہونے کے لیے کافی ہو۔

ان روایتوں میں ایک حقیقت پر زور دینا مقصود ہے نہ کہ محض ایک ظاہری شکل پر۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پوری زندگی میں متحد ہو کر رہنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تمام سرگرمیوں کو اتحاد کے ساتھ انجام دیں۔ ان کے ہر عمل میں اتحاد کے جذبہ کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ حتی کہ چند مسلمان اگر سفر کریں تو وہ بھی اپنا ایک امیر بنالیں اور متحدہ صورت میں سفر کریں۔ مسلمان جہاں بھی باہمی اتحاد میں کمی کریں گے وہیں شیطان ان کی صفوں کے اندر گھس جائے گا اور ان کے تمام مقاصد کو برباد کر دے گا۔ آپس کے تعلقات میں اگر دوری پیدا ہو جائے تو نہ مسجد کے اندر کی دنیا فتنوں سے خالی رہے گی اور نہ مسجد کے باہر کی دنیا۔

مسائلِ ملّت

مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا قرآنی حل ـــــ یہ وہ موضوع ہے جس پر مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ سوال بظاہر ایک سادہ سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظری اعتبار سے سادہ ہونے کے باوجود، عملی اعتبار سے وہ سادہ سوال نہیں۔ قرآن میں اگرچہ اس کا واضح جواب موجود ہے، مگر اس جواب کو پانا اور اس کو اختیار کرنا بلا شبہہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

"آج کون سی تاریخ ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنا ہو تو ہر شخص اس کو نہایت آسانی کے ساتھ جان لے گا۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آج سنیچر کا دن ہے اور فروری کا مہینہ، تو اپنی دیوار کا کلنڈر دیکھ کر آپ نہایت آسانی کے ساتھ جان لیں گے کہ آج کیا تاریخ ہے۔ آپ کلنڈر میں فروری کا صفحہ کھولیں گے اور پھر سنیچر کے خانہ میں دیکھیں گے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آج فروری ۱۹۹۰ کی دس تاریخ ہے۔

مگر قرآن سے اس طرح ٹکنیکل انداز میں مذکورہ سوال کا جواب معلوم کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے پاس پورا قرآن موجود ہو۔ آپ عربی زبان جانتے ہوں، حتی کہ آپ کسی مدرسہ میں شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز ہوں تب بھی یہ پیچیدگی بدستور باقی رہے گی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلنڈر سے تاریخ نکالنے کا معاملہ صرف ایک فنی معاملہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل کا قرآنی حل جاننے کا معاملہ، اسی کے ساتھ امتحان کا معاملہ بھی ہے۔ اس کا امتحان کا معاملہ ہونا اس کو انتہائی آسان ہونے کے باوجود، انتہائی مشکل بنا دیتا ہے۔

سنّتِ امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے موجودہ دنیا میں اس لئے رکھا ہے کہ اس کا امتحان لے (الملک ۲) موجودہ دنیا کی تمام چیزیں اسی مقصدِ حیات کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر ہدایت کے ساتھ ہمیشہ ایک شبہہ کا عنصر (element to doubt) موجود رہتا ہے۔ تاکہ آدمی کا امتحان لیا جائے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل سے شبہہ کا پردہ پھاڑتا ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو شبہہ

کے پردہ کو پھاڑ کر سچائی کو اس کی بے حجاب صورت میں دیکھ سکے۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے اس کو موجودہ دنیا میں کبھی ہدایت نہیں ملے گی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے:

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو پھر معاملہ کا فیصلہ ہو جائے۔ اس کے بعد انھیں کوئی مہلت نہ ملے۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے تب بھی اس کو آدمی ہی کی صورت میں بھیجتے۔ اور لوگوں کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس شبہ میں وہ اب مبتلا ہو رہے ہیں (الانعام ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی ہدایت کبھی اس طرح برہنہ صورت میں نہیں آتی کہ آدمی کے لئے اس میں کچھ بولنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ فرشتہ اگر اپنی اصل صورت میں خدا کا پیغام لے کر ظاہر ہو جائے تو کون ہوگا جو اس کے نمائندۂ خدا ہونے پر شبہ کرے۔ اس لئے خدا اپنے پیغام کی پیغام رسانی کا کام انسانوں میں سے کسی انسان کے ذریعہ کرتا ہے تاکہ پیغام کی سچائی کے باوجود اس میں شبہہ کا ایک پہلو باقی رہے۔

یہی اس دنیا کے لئے خدا کا قانون ہے۔ یہاں جب بھی ہدایت ظاہر ہوتی ہے، اس میں شبہ کا ایک پہلو بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ یہی آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہاں شبہ کے پردے کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہ کے پردے کو پھاڑ دے، وہ ہدایت کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لے گا اور جو آدمی شبہ کے اس پردے کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر بصیرت کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ یہ بصیرت گویا ایک قسم کی خدائی کسوٹی ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال کریں، وہ اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال نہ کر سکیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسائل کے قرآنی حل کو پہچاننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ کیوں کہ جب بھی قرآن کے حوالہ سے اس کا بتایا ہوا حل پیش کیا جاتا ہے، تو خواہ وہ کتنا ہی مدلل اور مُبرہن ہو، اس میں شبہ

کا ایک پہلو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس شبہ والے پہلو میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنی زندگی میں اختیار نہیں کر پاتے۔

دور اوّل کی مثال

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قدیم مکہ میں ایک شخص تھا اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش تو اس نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ سے کہا:

انا لنعلم ان الذی تقول حق ولکنا ان	ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق
اتبعناك خفنا ان تخرجنا العرب من	ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے
ارض مکۃ (التفسیر المظہری)	کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

شان نزول کی روایات کے مطابق، قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ ہم کو ہماری زمین سے اُچک لیا جائے گا (وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَآ ، القصص ۵۷)

قدیم مکہ میں وہاں کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ شرک تھا۔ انھوں نے یہ کیا تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ چنانچہ کعبہ میں ۳۶۰ مختلف بت جمع ہوگئے تھے۔ اس طرح مکہ کے لوگوں کو عرب کے تمام قبیلوں کی سرداری حاصل ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ معاشی فائدہ بھی تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لئے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے کہ والوں کو ملتے تھے۔ اس طرح شرک مکہ والوں کے لئے بیک وقت قیادت کا ذریعہ بھی تھا اور معاشیات کے حصول کا ذریعہ بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ یہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں، تو وہ اچانک تمام مشرک قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی ان سے چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود ایک شبہہ ان کے لئے قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

ہندستانی مسلمان

ہندستانی مسلمانوں کا حال بھی موجودہ زمانہ میں یہی ہو رہا ہے۔ مختلف شبہات کی بنا پر وہ قرآن سے رہنمائی لینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے جب قرآن کی بات رکھی جاتی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہی بات درست ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنے شبہات کی بنا پر قرآن کو اپنانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً جب ان کے سامنے صبر و اعراض کی آیتیں پیش کی جائیں تو وہ اس شبہہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم قومی معاملات میں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ جب ان کے سامنے قرآن کا دعوتی اور تعمیری پیغام رکھا جائے تو انھیں یہ شبہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر ہم سیاست کی مہم نہ چلائیں تو ہم ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے کٹ جائیں گے۔ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ہندو تمہارے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں اور مدعو سے مطالبہ اور احتجاج کو قرآن میں منع کیا گیا ہے، تو فوراً وہ یہ شبہ پیش کر دیں گے کہ اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو اس ملک میں ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ۔

آج کے سوال کے بارہ میں اصل مشکل یہی ہے۔ قرآن بلاشبہ ایک کامل اور مفصل کتاب ہے۔ اس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام سوالات کا واضح جواب موجود ہے۔ مگر اللہ تعالی کی سنت التباس (الانعام ۹) کی بنا پر ان تمام جوابات میں شبہ کا ایک عنصر بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا مسلمان جانچ کی میزان پر کھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ شبہ کا پردہ پھاڑ کر قرآن کی طرف بڑھے تو وہ یقیناً اپنے مسائل کا قرآنی حل پائے گا۔ اور اگر وہ شبہ کی بات میں اٹک جائے تو کوئی بھی آیت یا کوئی بھی حدیث اس کو رہنمائی دینے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوگی۔

اب میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کے قرآنی حل پر کلام کروں گا۔ اس سلسلہ میں میری گفتگو کے تین حصے ہوں گے۔ اور ہر حصہ کی بنیاد قرآن کی ایک واضح آیت پر ہوگی۔

تحفظ کا مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں، خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں، کے نزدیک ان کا نمبر ایک

مسئلہ جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ اسی مسئلہ پر سوچتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں سب سے زیادہ اسی سوال پر مرتکز رہتی ہیں۔ اس سوال کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم قرآن کو پڑھنا شروع کریں تو اس کو پڑھتے ہوئے ہم سورۂ المائدہ کی اس آیت (نمبر ۶۷) پر پہنچیں گے جس میں تحفظ کے مسئلہ کا جواب نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

یا ایها الرّسول بلّغ ما اُنزل الیك من ربّك و ان لم تفعل فما بلّغتَ رسالته و الله یعصمك من الناس ان الله لا یهدی القوم الکٰفرین

اے پیغمبر جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ اس میں عبارت النص کی سطح پر یہ بات نکل رہی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو محسوس ہو کہ ان کے لئے غیر اقوام کی طرف سے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے تو انھیں فوراً دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ یہی تحفظ کے مسئلہ کا سب سے زیادہ یقینی حل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہے تو عین اس وقت بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کو بدل دے۔ یہ فطرت پیدائشی طور پر اسلام کی طالب ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے دین اسلام پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر دشمن امکانی طور پر ان کا دوست ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا جائے تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ اور جب وہ اسلام قبول کر لے گا تو وہ بھی مسلمانوں کی ملت میں شامل ہو کر ان کا جزء بن جائے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

تاریخ نے بار بار قرآن کے اس اصول کی تصدیق کی ہے۔ دور اول میں عرب کے مشرکین نے ابتداءً رسول اللہ کی سخت مخالفت کی مگر آپ ان کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے صبر اور حکمت

کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بیس سال کے مختصر عرصہ میں تمام عرب قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو لوگ بظاہر آپ کے دشمن تھے، وہ آپ کے دوست اور ساتھی بن گئے۔ اسلام کے سپاہی بن کر انھوں نے اسلام کی عالمی تاریخ بنائی۔

۱۳ویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل ایک وحشی طوفان بن کر اٹھے اور انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک مسلمانوں کے تمام ملی نشانات کو مٹا ڈالا۔ بغداد کی عباسی خلافت ان کی فوجی یلغار کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئی۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ مسلمانوں کے قومی کھنڈر سے اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ اسلام کے عقیدہ نے فاتح تاتاریوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پچاس برس میں پوری تاریخ بدل گئی۔ مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔ ہلاکو نے مسلم دنیا کی جن مسجدوں کو ڈھایا تھا، اس کے پوتوں نے ان مسجدوں کو دوبارہ بنایا۔ اور ان مسجدوں میں خدائے واحد کے سامنے جھک کر اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

اسلامی تاریخ کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ (الٰہ آباد) کے اجلاس میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے اس طرح کیا تھا کہ ـــــ مسلمانوں کی تاریخ سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ ان کی تاریخ کے نازک مواقع پر یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو:

One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa.

یہی بات اقبال نے عوامی انداز میں اپنے اس شعر میں کہی ہے:

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو ماضی کے اعتبار سے سمجھا۔ مگر اس کو انھوں نے حال کے اعتبار سے دریافت نہیں کیا۔ انھیں یہ تو دکھائی دیا کہ گزری ہوئی تاریخ میں اسلام کی دعوتی طاقت نے مسلمانوں کو بچایا ہے مگر حال کے اعتبار سے وہ اس طاقت کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ میں جغرافی تقسیم پاکستان کو ہندستان کے مسلمانوں کا حل بتایا۔ حالاں کہ

انھیں مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا چاہئے تھا کہ تم غیر اقوام کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔ اس کے بعد تمہارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے جس طرح وہ ماضی میں حل ہو گئے۔

کسی قوم کے رہنما اور دانشور ہی وہ لوگ ہیں جو پوری قوم کا ذہن بناتے ہیں۔ ان کی تقریر میں اور تحریریں لوگوں کو کسی ایک طرف یا دوسری طرف لے جاتی ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کے رہنماؤں اور دانشوروں میں دعوتی ذہن موجود نہیں۔ وہ صرف قومی طرز فکر کو جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ قومی طرز فکر کے مطابق لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ملک کے قومی مسائل تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر انھیں ملک کے دعوتی امکانات نظر نہیں آتے۔

اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ہندستان میں کروروں کی تعداد میں وہ لوگ آباد ہیں جن کو اچھوت یا پست اقوام کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب اور روایات اس میں مانع ہیں کہ ان کو ملک میں برابر کا سماجی درجہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مستقل طور پر مایوسی اور ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر (۱۸۹۳-۱۹۵۶) ایک اچھوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ مگر انھوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ چوٹی کے دانشور بن گئے۔ اپنی ذہنی اور علمی خصوصیات کی بنا پر انھوں نے پوری اچھوت برادری میں واحد نمائندہ لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو اس بات کی بہت زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنی قوم کو اوپر اٹھائیں اور ان کو ملکی سماج میں برابری کا درجہ دیں۔ ہندو ازم اور ہندو سماج کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنی قوم کو یہ درجہ نہیں دلا سکتے۔ دوسری طرف اسلام کے مطالعہ نے انھیں بتایا کہ یہ مطلوبہ درجہ ان کو اور ان کی قوم کو نہایت کامیابی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کر لیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسلام پست طبقات کو وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی

انھیں ضرورت ہے۔ اقتصادی اعتبار سے اسلام کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سماجی اعتبار سے مسلمان پورے انڈیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ملک کے ہر صوبے میں موجود ہیں اور وہ پست طبقات کے نومسلموں کی پوری مدد کرسکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے پست طبقات وہ تمام حقوق پالیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں:

Islam, seems to give the Depressed Classes all they need. Financially, the resources behind Islam are boundless. Socially, the Mohammedans are spread all over India. There are Mohammedans in every province and they can take care of new converts from the Depressed Classes and render them all help. Politically the Depressed Classes will get all the rights which Mohammedans are entitled to.

Politics of Conversion, New Delhi, 1986, p.321

واقعات بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر اسلام کے بالکل قریب آچکے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کرکے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوجائیں۔ حتی کہ انھوں نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ کو وہ اعلان کیا جس کو ایولا ڈیکلریشن (Yeola Declaration) کہا جاتا ہے۔ اس اعلان میں انھوں نے ۴۰ ملین ہریجنوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے موجودہ مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہوجائیں (صفحہ ۳۲۲)

مگر مسلم لیڈروں میں سے کسی بھی قابل ذکر شخص نے ڈاکٹر امبیڈکر کی طرف توجہ نہ کی۔ حتی کہ کسی نے ان سے ملاقات کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ (۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کے درمیان) مسلمانوں نے بحیثیت قوم یہ مظاہرہ کیا کہ انھیں ملک کی تقسیم کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ مسلم رہنماؤں نے ہریجنوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل کرنے سے کوئی حقیقی دل چسپی نہ لی۔ انھوں نے اپنی ساری دل چسپی اس بات کے لئے دکھائی کہ ملک سیاسی اعتبار سے دو حصوں (ہندو انڈیا، مسلم انڈیا) میں بانٹ دیا جائے۔

مسلمانوں کی یہ قومی پالیسی ڈاکٹر امبیڈکر کی امیدوں کے سراسر خلاف تھی۔ انھوں نے قدرتی طور پر یہ سمجھا کہ بٹوارہ کے بعد وہ اور ان کی قوم ہندو انڈیا میں باقی رہے گی۔ کیونکہ ہریجن زیادہ تر اسی علاقہ میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد کرسکیں۔ دوسری طرف وہ تبدیلی مذہب کے نتیجہ میں مستقل طور پر ہندو غضب ناکی کا شکار ہوکر رہ جائیں گے۔

چنانچہ انھوں نے اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کا ارادہ ختم کردیا۔

مسلم رہنماؤں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہ سمجھتے کہ پست طبقات کو اسلام میں داخل کرکے اگر وہ ان کا درجہ اونچا کریں تو یہ خود ان کے لئے بھی حد درجہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد ان کی آبادی ملک میں مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ فی صد ہو جائے گی۔ اور اگر آئندہ تبلیغی عمل کو جاری رکھا جائے تو قریبی مستقبل میں وہ پچاس فیصد سے بھی زیادہ ہوسکتے ہیں۔ حتی کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی کہ وہ "پاکستان" کی صورت میں اپنے لئے سیاسی پناہ کا ایک گوشہ تلاش کریں۔ مگر مسلم رہنماؤں کے غیر قرآنی ذہن کا یہ نقصان ہوا کہ انھیں قومی خطرات دکھائی دئے مگر انھیں دعوتی امکان نظر نہ آیا۔

دعوت الی اللہ سے عصمت من الناس کا فائدہ حاصل ہونا اتنا یقینی ہے کہ وہ کسی براہ راست کوشش کے بغیر اپنے آپ حاصل ہوسکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنی کسی نادانی سے اس کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنیں۔

اس کا زندہ ثبوت ۱۹ویں صدی اور پھر ۲۰ویں صدی کے آغاز کی تاریخ ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ ہندستان میں پھیل رہا تھا۔ ہر روز بلا مبالغہ ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اگر اس عمل کو بدستور جاری رہنے دیا جاتا تو کسی اقبال یا جناح کی ضرورت نہ تھی جو بٹوارہ کی صورت میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تجویز کرے۔ مگر پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد مسلمانوں میں جو قومی تحریکیں اٹھیں، جس کا آخری عروج آل انڈیا مسلم لیگ تھی، اس نے سارا نقشہ بگاڑ دیا۔ ان تحریکوں نے انتہائی غیر دانش مندانہ طور پر ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان اختلافی باتوں کو ابھارا۔ انھوں نے اپنی دھواں دھار کارروائی کے ذریعہ دونوں قوموں میں نفرت کی ناقابل عبور دیوار کھڑی کردی۔ مسلم لیڈروں کی یہی نفرت انگیز سیاست ہے جس نے اسلام کی اشاعت کے اس سیلاب کو روک دیا جو مغل سلطنت کے زوال کے بعد انیسویں صدی میں اس ملک میں جاری ہوا تھا۔

ہندستان میں مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کے لئے دو میں سے ایک کام کرنا تھا۔ یا تو وہ سچے داعی بن کر دوسری قوموں کو اپنا مدعو بناتے اور صبر اور حکمت کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے تو دوسرا کام ان کے کرنے کا یہ تھا کہ وہ اسلام کی فطری اشاعت کے عمل میں

کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کریں۔ وہ اس معاملہ میں خاموش ہوجائیں اور اسلام کو اپنی ذاتی طاقت سے آگے بڑھنے کا موقع دیں۔

مسلمان ان دونوں میں سے جو بھی طریقہ اختیار کرتے اس کا نتیجہ جلد یا بدیر ایک ہی نکلتا۔ مگر وہ نہ اسلام کے براہ راست داعی بن سکے اور نہ بالواسطہ معاون۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کی پرشور اور ہنگامہ خیز سیاست کے باوجود ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

موجودہ مسلمان

آج بھی ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہی ہے۔ اس موقع کو استعمال کرنے کا میدان اب بھی ان کے لئے کھلا ہوا ہے۔ آج بھی اگر ان کے اندر داعیانہ ذہن پیدا ہو جائے تو آج بھی وہ اس میدان میں متحرک ہو کر اس کے تمام فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ سورہ المائدہ (۶۷) میں خدا کی جو سنت بتائی گئی ہے، وہ ایک ابدی سنت ہے۔ وہ جس طرح ماضی کے لئے تھی، اسی طرح وہ آج کے لئے بھی ہے، اور وہ قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔

انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ آج بھی جو انسان پیدا ہو رہے ہیں وہ یقیناً فطرت اللہ پر پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اپنی پیدائشی فطرت کے تحت اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اس کی فطرت کے دروازے کو کھٹکھٹائے، تاکہ وہ اپنے خالق کے سکھائے ہوئے سبق کے مطابق اس کا جواب دے سکے۔

تاہم اس دعوتی امکان کو حاصل کرنے کے لئے ایک شرط لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ صبر و اعراض ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں داعی بننے کے لئے یہ کرنا ہوگا کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ اپنے تمام نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ یہ ختم کرنا مصنوعی طور پر نہ ہو، بلکہ دل کی گہرائی کے ساتھ ہو۔ اب تک وہ دوسری قوم کو اپنا حریف بنائے ہوئے تھے۔ اب انھیں دوسری قوم کو اپنا دعوتی محبوب بنانا ہوگا۔ انھیں اس حد تک ان کا خیر خواہ بننا ہوگا کہ ان کے دل سے دوسری قوم کے لوگوں کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

جس دن مسلمان ایسا کریں گے، اسی دن اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ وہ نتیجہ بھی ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا جو دعوت الی اللہ کے ساتھ اللہ نے ابدی طور پر مقدر کر دیا ہے۔

عسر کے ساتھ یسر

قرآن میں ایک نہایت اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا کبھی یک طرفہ طور پر کسی کے لئے غیر موافق نہیں ہو سکتی۔ خدا کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہمیشہ مشکل کے ساتھ آسانی بھی موجود رہے گی۔ کوئی شخص یا قوم جب بھی کسی محرومی سے دوچار ہو تو یقینی طور پر وہیں اس کے لئے امکانات اور مواقع کا نیا دروازہ بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ اصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَاِنَّ مع العسر یسرا۔ اِنَّ مع العسر یسرا (الانشراح)

پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے
بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں نہ صرف یہ ہے کہ ہر مشکل کا ایک کامیاب حل ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بلکہ مزید اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مشکل کے مقابلہ میں حل کی مقدار دوگنا ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ لن یغلب عسر یسرین (ایک مشکل دو آسانی پر غالب نہیں آسکتی)

ہندستان کے مسلم رہنما اور دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلسل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے مشکلات ہیں۔ یہاں ان کے خلاف تعصب اور ظلم کیا جاتا ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا روزانہ یہی بات دہرا رہا ہے۔

مگر اس قسم کے بیانات خدا کی کتاب کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مسلمان خدا کی کتاب کے بیانات پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انھیں خدا کی کتاب پر یقین ہوتا تو وہ مشکل پیش آنے کی صورت میں آسانی کو تلاش کرتے۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ جہاں مشکل پائی جارہی تھی، وہیں آسانی (اس کا حل) بھی دگنا مقدار میں موجود تھا۔ اس کے بعد ان کے لئے اعلان کرنے کی چیز مسئلہ کا حل ہوتا نہ کہ صرف مسائل اور مشکلات۔

ہندو مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو ان کے حق میں متعصب اور ظالم ہے ہندوؤں کے تعصب اور عناد نے ان کے لئے ناقابل حل مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ اس ملک میں ان کے لئے باعزت زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند ہیں۔

مگر یہ رائے جن ہندوؤں کے تجربات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ تر عام قسم کے ہندو ہیں۔ وہ ہندو جو جلسہ اور جلوس کی بھیڑ میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو سڑکوں پر جمع ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ جو فساد کے موقع پر لوٹتے اور جلاتے ہیں۔ یہ سب ہندو عوام ہوتے ہیں نہ کہ ہندو خواص۔ مسلمانوں کو ہندو عوام یا ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے جو تجربہ ہو رہا ہے، اس کو وہ پوری ہندو قوم پر چسپاں کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہندو سب کے سب ان کے مخالف ہیں۔

مگر یہ رائے خطرناک حد تک خلاف واقعہ ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی طبقہ اور ہندو عوام دونوں میں بلاشبہ ایک ایسا گروہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عناد رکھتا ہے۔ مگر ہندوؤں کا خواص طبقہ جس نے جدید طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، اس کی بہت بڑی اکثریت فرقہ وارانہ عناد اور شورش کی سیاست میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی۔ مزید یہ کہ یہی ہندو خواص ہیں جو اپنی تعلیم کی بنا پر ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر قابض ہیں۔ وہی ملک کا پورا سیاسی اور اقتصادی نظام چلا رہے ہیں۔ اخبارات اور تمام اشاعتی ادارے انھیں کے تحت چل رہے ہیں۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک حوالہ دوں گا۔ ٹائمس آف انڈیا (9 فروری 1990) میں ایک مفصل آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے مسٹر چندن متراہیں، اور اس کا عنوان ہے:

Militant Hinduism is self-limiting

مضمون نگار الٰہ آباد کے اگھ میلہ (جنوری 1990) میں موجود تھے جہاں وشو ہندو پریشد نے اپنا "عظیم الشان" جلسہ کیا تھا۔ وہ وشو ہندو پریشد اور دوسری فرقہ پرست ہندو جماعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اگرچہ "رام جنم بھومی" کا جذباتی اشو لے کر عوامی ہندوؤں کی ایک بھیڑ اپنے گرد جمع کر لی ہے اور نومبر 1989 کے الکشن میں وقتی کامیابی بھی حاصل کی ہے، مگر مذہب کے نام پر اٹھنے والی ان ہندو جماعتوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے طبقۂ خواص کو اب تک اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔

وہ لکھتے ہیں کہ تاہم بی جے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ دسیوں سال کی سخت کوشش کے باوجود وہ اس میں ناکام رہی ہے کہ سیکولر شہری ہندوؤں سے اپنے حق میں فکری جواز حاصل کر سکے جو کہ عوام کی رائے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اور یہ بعید از قیاس ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اپنی اس کوشش

میں کامیاب ہو سکے:

The BJP's problem, however, is that despite decades of strenuous effort, it has failed to acquire intellectual legitimacy from the secularised, urban Hindus who dominate public opinion. And it is unlikely to succeed in this endeavour in the foreseeable future.

مذہبی طبقہ اگر سچے مذہب پر ہو تو وہ انصاف پر کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب مذہبی طبقہ میں بگاڑ آجائے تو اس کے پاس تعصب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ ہندوؤں کا موجودہ مذہبی طبقہ حقیقۃً ایک بگڑا ہوا مذہبی طبقہ ہے، اس لئے اس کا مذہب تمام تر تعصب پر مبنی ہے۔ وہ مذہبی سچائی پر نہیں بلکہ مسلم عناد کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔

ہندو عوام کا معاملہ بھی ایک اور اعتبار سے یہی ہے۔ ہندو عوام کی اکثریت جاہل اور غریب ہے۔ وہ ایک بے شعور انسانوں کی بھیڑ ہے۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھی شوشہ کی بات کہہ کر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک قریبی مثال یہ ہے کہ ہندو عوام پچھلی نصف صدی سے زیادہ تر کانگرس کو ووٹ دیتے آرہے تھے۔ مگر ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہونے والے الکشن میں فرقہ پرست ہندو جماعتوں نے اپنے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ راجیو گاندھی ایک سیکولر آدمی ہے۔ وہ خود پارسی کا لڑکا ہے، اور ایک عیسائی عورت سے شادی کئے ہوئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اجودھیا میں مقدس رام مندر کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر شمالی ہند کے ہندو بھڑک گئے اور انھوں نے مخالفانہ ووٹ دے کر راجیو گاندھی کی پارٹی کو شمالی ہند میں ہرا دیا۔

ان اسباب سے مسلمانوں کے لئے عقلمندی کی بات یہ ہے کہ وہ اختلافی معاملات کو ہندو خواص کی سطح پر لا کر حل کریں۔ وہ اس کو ہندو عوام (مذہبی طبقہ اور عوامی طبقہ) تک نہ جانے دیں۔

موجودہ ہندو قوم میں دو مختلف طبقے کا ہونا قرآن کے اس اصول کے عین مطابق ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اگر مسلمانوں کے لئے عسر کے درجہ میں ہے، تو انھیں ہندوؤں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مسلمانوں کے لئے یُسر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہبی طبقہ کے اندر اگر مسلمانوں کے خلاف تعصب وعناد ہے، تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف کا اور حقیقت پسندی کا فیصلہ کرتا ہے۔

مزید یہ کہ قانون الٰہی کے مطابق، یہاں بھی عسر کے مقابلہ میں یُسر کی طاقت زیادہ ہے۔

ہندوؤں کے فرقہ پرست طبقہ کے پاس صرف جذباتی نعرے ہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہی ہر قسم کے علمی، انتظامی، اقتصادی اور صحافتی اداروں پر قابض ہے۔ اعلیٰ سطح کے تقریباً تمام فیصلے اسی کے دفتروں سے کئے جاتے ہیں۔

دو مسجدوں کا قصہ

یہاں میں ایک تقابلی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس سے اس اصول کی صداقت خالص عملی اور واقعاتی سطح پر ثابت ہوتی ہے۔ یہ اجودھیا اور دہلی کی مسجد کی مثال ہے۔

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اپنی موجودہ شکل میں ۱۹۸۶ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مسلم رہنماؤں کی رہنمائی میں کیا کیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ جلسہ اور جلوس، ریلی اور مارچ، بائیکاٹ اور لاؤڈ اسپیکر کے شور کے ذریعہ انھوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کوشش کی۔ یہ طریقہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہندو عوام اور ہندو مذہبی طبقہ کی سطح پر مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ سراسر ناکام رہا۔

سڑک کی سیاست نے جوابی طور پر ہندوؤں میں اسی قسم کی شدید تر سیاست پیدا کی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقہ کو یہ موقع ملا کہ وہ جذباتی اپیلیں کر کے ہندو عوام کو بھڑکا دیں۔ انھوں نے ہندو عوام سے کہا کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارے کو مان کر ہم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی شکست کھائی تھی، اب اجودھیا میں رام جنم بھومی کی تعمیر کے سوال پر ہم مسلمانوں سے دوسری شکست (second defeat). کبھی قبول نہیں کریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کے ہندو عوام بھڑک اٹھے۔ جگہ جگہ خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ عوامی جذبہ اور جوش نے مسئلہ کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ جو چیز پہلے محدود مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ پورے ملک کے لئے قومی وقار کا مسئلہ بن گئی۔ مسلمانوں کو بابری مسجد تو حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ بہت سی چیزیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل تھیں وہ بھی انھوں نے اپنے غلط طریق کار کے نتیجہ میں کھو دیں۔ (اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون "حکیمانہ تدبیر" ملاحظہ فرمائیں)

اب اس کے برعکس ایک مثال لیجئے۔ نئی دہلی کے ایک قیمتی علاقہ میں ایک قدیم شکستہ مسجد تھی۔ جس کے ساتھ وسیع زمین شامل تھی۔ اس زمین کا رقبہ مجموعی طور پر اٹھارہ ایکڑ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد اس زمین پر دہلی کی حکومت کے تین محکموں (آرکیالوجی، ڈی ڈی اے اور کارپوریشن) نے قبضہ کر لیا۔ وہاں انھوں نے اپنا دفتر قائم کر دیا۔ ان کا مقصد اس کو جدید قسم کے پکنک اسپاٹ میں تبدیل کرنا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق کام بھی شروع ہو گیا۔ حتی کہ انھوں نے وہاں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔

اس کے بعد ایک مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ اس قدیم مسجد پر قبضہ کیا جائے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے نہ مسلمانوں کا جلسہ کیا، نہ اخباروں میں بیانات چھپوائے، نہ پوسٹر بازی کی مہم چلائی، نہ سڑکوں پر "ہماری مسجد ہم کو واپس کرو" کے نعرے لگائے۔ اس قسم کے کسی بھی مظاہراتی کام کو چھوڑ کر انھوں نے یہ کیا کہ نہایت خاموشی سے اس علاقہ کے ہندو خواص سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان سے نجی ملاقاتوں میں کہا کہ یہ ایک مسجد (عبادت خانہ) ہے اور عبادت خانہ ہر حال میں مقدس ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو۔ اس لئے آپ لوگ اس کو واگزار کرانے میں ہماری مدد کریں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے مذکورہ تینوں محکموں سے باقاعدہ ربط قائم کیا۔ ہر قسم کے دستاویزات جمع کئے۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط اور ڈرافٹ جو انگریزی میں ہوتے تھے وہ خود تیار کرتا اور مولوی صاحب کے ساتھ متعلقہ دفاتر میں جاتا۔

یہ خاموش دفتری جنگ تین سال تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ مذکورہ ہندو سکریٹری اور کچھ دوسرے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی مدد سے مذکورہ تینوں محکمے اس پر راضی ہو گئے کہ وہ مسجد کو واگزار کر دیں۔ مولوی صاحب کو باقاعدہ تحریری طور پر یہ اجازت مل گئی کہ وہ مسجد کو آباد کر سکتے ہیں اور ملحقہ ۱۸ ایکڑ زمین پر ۸ فٹ اونچی باؤنڈری تعمیر کر سکتے ہیں۔ آج یہاں نہ صرف مسجد اور مدرسہ قائم ہے بلکہ تمام تمدنی سہولتیں مثلاً بجلی، ٹیلیفون اور سیور لائن بھی وہاں آ چکی ہیں۔ اب یہ جگہ ایک پر رونق اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اجودھیا کی مسجد کو مسلمانوں نے مزید نقصان کے ساتھ کھو دیا۔ اور دہلی کی نسبتاً زیادہ بڑی اور زیادہ اہم مسجد کو انھوں نے شاندار طور پر دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں

کے نادان رہنماؤں نے اجودھیا کی مسجد کو جاہل عوام کی سطح پر حل کرنا چاہا۔ اس کے برعکس دہلی کی مسجد کے مسئلہ کو تعلیم یافتہ خواص کی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی واحد وجہ ہے جس کے نتیجہ میں ایک مقام پر مسلمان مفتوح اور مغلوب ہو گئے اور دوسرے مقام پر انھوں نے شاندار فتح حاصل کی۔

یہ اصول صرف مسجد کے لئے خاص نہیں۔ مسلمان جس معاملہ میں بھی عوامی ہنگامہ کھڑا کریں گے وہاں ان کا ٹکراؤ عوامی ہندوؤں سے ہو جائے گا۔ اور آخر کار ان کو شکست ہوگی۔ اس کے برعکس جب وہ خاموش انداز اختیار کریں گے اور ہندوؤں کے خواص طبقہ سے ربط قائم کریں گے تو معاملہ ہندو خواص کی سطح پر رہے گا۔ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ اپنے موافق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، بشرطیکہ ان کا معاملہ انصاف اور صداقت پر مبنی ہو۔

ہم پئیں، وہ نہ پئیں

اس سلسلہ میں ایک صحابی کا قول نہایت بامعنی اور سبق آموز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غزوۂ بدر پیش آیا تو یہ سوال تھا کہ میدان جنگ کے لئے کس مقام کا انتخاب کیا جائے۔ ایک صحابی الحباب بن المنذر الجموح نے ایک مقام کی تجویز پیش کی۔ اس کی خصوصیت انھوں نے یہ بتائی کہ جب وہاں ہم ٹھہریں گے تو پانی کے چشمے ہمارے قبضہ میں آجائیں گے۔ اور فریق ثانی پانی کے ذخائر سے محروم ہو جائے گا۔ اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پھر ہم پئیں گے اور وہ نہ پئیں گے (فنشرب ولا یشربون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے فوراً اس کو قبول کر لیا (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۶۱)

اسی قسم کا معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو عوام کی سطح پر لے جائیں تو ایسی صورت میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ پانی پئے گا، اور مسلمان پانی سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو خواص کی سطح پر رکھ کر طے کریں تو ایسی صورت میں پانی مسلمان کے حصہ میں آئے گا، اور ہندو فرقہ پرست پانی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

دور اول کی مثال

عوام اور خواص کے اس فرق کی مثال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک تعداد مکہ سے ہجرت کر کے سمندر پار کے ملک حبش چلی گئی تھی۔ وہاں ان کے لئے عوام اور مذہبی طبقہ کی طرف سے اسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے جو ہم کو ہندستان میں درپیش ہیں۔ مگر یہ مسائل جب وہاں کے خواص کے سامنے آئے تو انتہائی انصاف کے ساتھ یہ مسائل مسلمانوں کے حق میں طے کر دئے گئے۔

مسلمان جب حبش کے ساحل پر اترے تو وہاں کے باشندے خارجی ہونے کی بنا پر ان کو حقیر سمجھتے تھے اور انھیں پریشان کرتے تھے۔ یہ مسلمان اگر مشتعل ہو کر عوام کے خلاف ایجی ٹیشن کرتے تو نتیجہ برعکس نکلتا۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور مقامی عوام اکثریت میں، اس لئے مسئلہ بڑھتا اور مسلمانوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں نے عوامی سطح پر شکایت اور احتجاج سے کامل پرہیز کیا۔ وہ ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب کہ ان کو بادشاہ وقت نجاشی کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ نجاشی نے ان سے پوچھا کہ کیا حبش میں کوئی تم کو ستاتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہاں۔ نجاشی نے فیصلہ دیا کہ جو شخص مسلمانوں کو ستائے، اس سے چار درھم بطور جرمانہ وصول کر کے مظلوم مسلمان کو دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اتنا جرمانہ کافی ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ نجاشی نے دوبارہ فیصلہ دیا اور جرمانہ کی مقدار بڑھا کر آٹھ درھم کر دی (حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۳۵۵)

اسی ہجرت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جب مکہ سے حبش پہنچے تو مکہ کے مشرکین نے اپنا ایک وفد حبش بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے واپس لائے۔ مشرکین کے وفد نے حبش پہنچ کر وہاں کے مذہبی طبقہ سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں کو سن کر وہاں کے مذہبی پیشواؤں کا گروہ (بگڑا ہوا مذہبی طبقہ) ان کا حامی بن گیا۔ انھوں نے نجاشی سے کہا کہ مسلم مہاجرین کو اس وفد کے حوالے کر دینا چاہئے۔ حتی کہ ایک موقع پر انھوں نے دربار میں مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ شور وغل برپا کر دیا۔ ایسی حالت میں معاملہ اگر اس مذہبی طبقہ کی سطح پر لایا جاتا تو یقیناً اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوتا۔

مگر مسلمان وہاں کے مذہبی طبقہ سے مطلق نہیں الجھے۔ انھوں نے مذہبی طبقہ کو نظر انداز کرتے

ہوئے صرف نجاشی کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجاشی نے مکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے مشرکین مکہ کے وفد کو دربار سے نکال دیا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ جب تک چاہو حبش میں عزت کے ساتھ رہو۔ یہاں سے نکلنے پر تمھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا (سیرۃ ابن کثیر جلد ثانی)

حرف آخر

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ مقابلہ کی یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہے گی، کیوں کہ اس کو کسی "دشمن اسلام" نے قائم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کو خود خدا نے اپنی دنیا میں قائم کیا ہے۔ اس لئے مخالفین کی سازش اور فساد کو لے کر اس کے خلاف فریاد کرنا سراسر احمقانہ ہے۔ اس قسم کی فریاد کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

اس دنیا میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھا جائے۔ "مخالفین" کے منصوبوں کو جان کر ان کے خلاف حکیمانہ انداز میں جوابی منصوبہ بندی کی جائے۔ مخالف حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے۔ ہر پیش آنے والے عُسر کو یُسر کی طاقت سے زیر کیا جائے۔ اس دنیا میں کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو مشکل کو اپنی غذا بنا سکے، جو ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کے لئے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ وہ حالات کے خلاف بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں۔

روشن مستقبل

الرسالہ جنوری ۹۱ خصوصی نمبر کے طور پر بعنوان "روشن مستقبل" شائع کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اب اس شمارہ کو علیحدہ سے ایک مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ جو حضرات اس کو زیادہ تعداد میں منگوا کر تقسیم کرنا چاہیں ان کو خصوصی رعایت کے ساتھ یہ کتابچہ فراہم کیا جائے گا۔

ایک سفر

سوویت یونین میں گلاسناسٹ (openness) کی پالیسی کے تحت حال میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کے تحت روسی حکومت چاہتی ہے کہ بیرونی دنیا سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ چنانچہ مختلف طبقہ کے لوگوں کو سوویت یونین جانے کے مواقع دئے جا رہے ہیں۔

اسی میں سے یہ ہے کہ سوویت حکومت عالم اسلام کی مختلف شخصیتوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ سوویت یونین جاکر اپنی آنکھ سے وہاں کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھیں۔ مثلاً سعودی عرب کے شیخ محمد بن ناصر العبودی اسی سلسلہ میں روس جا چکے ہیں۔ چنانچہ سوویت حکومت نے مجھ کو بھی روس کے سفر کی دعوت دی۔ اس کے تحت جولائی۔ اگست ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کا سفر ہوا۔

شیخ عبودی (رابطۃ الاسلامی، مکہ) کی سرکردگی میں جو وفد پندرہ دن کے لئے سوویت یونین گیا تھا، اس نے وہاں کی مسلم جمہوریتوں کا دورہ کیا۔ روسی مسلمانوں کے حالات اور ضرورتوں کا جائزہ لیا۔ اس نے روسی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اسلام کی راہ میں تنہا نہیں ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔

وفد نے وہاں کی ان مسجدوں کا بھی جائزہ لیا جو حال میں واگذار کی گئی ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان مسجدوں کی اصلاح ومرمت کافی ہے یا ان کو از سر نو تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ روسی حکومت نے جن مقامات پر نئی مسجدوں کی تعمیر کی اجازت دی ہے، ان کے لئے مناسب زمین حاصل کرنے کی بابت ذمہ داروں سے گفت گو کی۔

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا جب کہ ابھی میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم سن شعور کو پہنچتے ہی اشتراکی روس کی باتیں میرے کان میں پڑنے لگیں۔ غالباً ۱۹۳۶ کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڈھ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۸۸۴ – ۱۹۵۵) کے مکان پر تھا۔ گفت گو کے دوران سوویت روس کا ذکر آیا۔ انھوں نے خاندان کے ایک نوجوان کا نام لے کر کہا کہ ان کے کورس میں روسی زبان کا بھی ایک پرچہ ہے۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد امید ہے کہ وہ روس جائیں گے۔ پھر ان کے ذریعہ سے وہاں کی صحیح باتیں معلوم ہوں گی۔ مذکورہ نوجوان اب بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ تاہم وہ روس نہ جا سکے۔ سرکاری

ملازمت کے بعد اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۱۹۳۶ میں میں ایک مدرسہ میں کتاب النحو اور کتاب الصرف کے اسباق پڑھ رہا تھا۔ اس وقت بظاہر ناقابل تصور تھا کہ میں کبھی روس کا سفر کرسکوں گا۔ مگر عجیب اتفاق کہ اس واقعہ کے تقریباً ۵۵ سال بعد یہ "قرعہ" میرے نام آیا۔ جولائی ۱۹۹۰ میں میں نے اس ملک کا سفر کیا جس کا پورا نام یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس (USSR) ہے۔

۱۱ جون ۱۹۹۰ کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ ۲۸ جولائی کے لئے انھوں نے میری سیٹ ریزرو کرادی ہے۔ اس سے پہلے بھی تاریخ کے تعین کے بغیر وہ اس پروگرام کی بابت مجھ کو اطلاع دے چکے تھے۔ جولائی کے مہینہ میں میری بعض مصروفیات تھیں۔ مگر میں نے ان مصروفیات میں تبدیلی کرکے ان کی پیش کش کو قبول کرلیا۔

کسی روسی آدمی کو پہلی بار میں نے پچاس سال قبل دیکھا تھا۔ اس وقت میں ایک عربی مدرسہ (الاصلاح، اعظم گڈھ) میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ صدر مدرس مولانا امین احسن اصلاحی اپنے کمرہ کی طرف چلے تو ان کے ساتھ نئے حلیہ کا ایک آدمی تھا۔ صاف رنگ، بھاری جسم، سر پر غیر ہندستانی وضع کی ٹوپی۔ میری ان سے ملاقات تو نہ ہوسکی۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انھیں کئی بار مدرسہ کے احاطے میں چلتے پھرتے دیکھا۔ اتنا یاد ہے کہ مولانا اصلاحی سے ان کی گفتگو عربی زبان میں ہوتی تھی۔ اس وقت مدرسہ کی آبادی میں وہ سب سے زیادہ پرشکوہ شخصیت والے نظر آئے۔

یہ علامہ موسیٰ جاراللہ روسی تھے۔ مجھے یاد تھا کہ اسی زمانہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کی بابت اپنے ماہنامہ الاصلاح میں "شذرات" کے تحت کچھ لکھا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس مضمون کو دیکھوں۔ میں نے مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی کو خط لکھا کہ الاصلاح کے مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی روانہ کردیں۔ خط لکھنے کے چند دن بعد پانچ صفحہ کے اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے بذریعہ ڈاک دہلی میں مل گئی۔ واضح ہو کہ دہلی اور سرائمیر (اعظم گڈھ) کے درمیان ۸۰۰ کیلو میٹر کا فاصلہ ہے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر اس میں شکر کا عظیم الشان سرمایہ موجود ہے۔ یہ انسانی

ذہن کی کیسی عجیب خصوصیت ہے کہ ۵۰ سال پہلے کا واقعہ ایک سکنڈ میں اس کو یاد آجائے۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ زمانہ طالب علمی کے بعد دوبارہ کبھی اس کا ذکر آیا ہو۔ پھر ڈاک کا یہ نظام انسان کے لئے کتنی بڑی سہولت ہے۔ اگر موجودہ وسائل نہ ہوں تو مذکورہ مضمون کو حاصل کرنے کے لئے مجھے سولہ سو کیلو میٹر کا سفر طے کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس میں غالباً دو ماہ لگ جاتے۔ پھر فوٹو کاپی کی مشینیں کتنی بڑی نعمت ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی چیز کا ویسا کا ویسا ہی عکس بلا تاخیر حاصل کر لیا جائے۔

یہ باتیں بظاہر بالکل معمولی ہیں، مگر معمولی چیز کو غیر معمولی چیز کے روپ میں دیکھنے ہی کا نام شکر ہے۔ اگر آدمی جذبۂ شکر کے ابلنے کے لئے انوکھے معجزہ کا انتظار کرنے تو وہ کبھی بھی خدا کا سچا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسے اسباب شکر کسی کے لئے ظاہر ہونے والے ہی نہیں۔

علامہ موسیٰ جار اللہ ۱۹۳۸ کے وسط میں روس سے پناہ گزیں کے طور پر ہندستان آئے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا ان کے بارہ میں مضمون الاصلاح کے شمارہ جون ۱۹۳۸ میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ علامہ موسیٰ جار اللہ عربی، فارسی، ترکی، روسی اور فرنچ زبانیں بخوبی جانتے ہیں۔ علوم مشرقیہ کی مختلف شاخوں میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کی اس زمانہ کی تمام سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کو قریب سے جانتے ہیں۔ وہ دو دن مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر، اعظم گڈھ) میں مقیم رہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے: "علامہ موسیٰ جار اللہ نے مجھ سے سوال کیا کہ ہندستان میں علوم عربیہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، تمہارے خیال میں اس کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ عربی تعلیم، مدارس عربیہ اور ساتھ ہی مذہب کی تباہی۔ مجھے خیال تھا کہ علامہ اس کی تردید کریں گے لیکن انھوں نے اس کی حرف حرف تائید کی۔"

میں نے اپنی تحریری زندگی شروع کی تو میں کمیونزم کا مخالف بن چکا تھا۔ کانگرس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں ہوا تھا۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو کی تحریک پر کانگرس نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ ہمارا مقصد ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانا ہے۔ اسی زمانہ میں میں نے اس کے بارہ

میں ایک مقالہ لکھا تھا جو" ہندستان کی منزل : سوشلزم یا اسلام" کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں دو نوں نظاموں کا تقابل کرنے کے بعد آخر میں میں نے لکھا تھا :

پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ ہندستان کی منزل سوشلزم ہے۔

ہم کہتے ہیں : ہندستان کی منزل اسلام ہے۔

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر زیادہ جامع کتاب لکھی جو اپریل ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔ اس کے جلد ہی بعد اس موضوع پر میری دوسری کتاب اگست ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ۔

پچھلے ۳۵ سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند (مثلاً ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی وغیرہ) سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک "مخالف" کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کئے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لئے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اسی صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لئے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے " اکابر" پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لئے بلائیں۔

موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنا دیا ہے۔

اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ یہ ادارے سطحی انسانوں کی سرائے بن کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے افراد درکار ہیں۔ مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور تقلید شخصی کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ وہاں صرف تنگ نظر اور مقلد انسان ہی بن سکتے ہیں۔ ان اداروں سے مجتہدانہ اور صاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجوبہ ہوگا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔

روس کے لئے روانگی سے پہلے وہ لوگ "روس میں اسلام" کی بابت ایک "فلم شو" دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے تحت ۲۱ جون ۱۹۹۰ کو پہلی بار نئی دہلی کے روسی کلچرل سنٹر کے دفتر میں جانا ہوا۔ وہاں انھوں نے ایک مخصوص ہال میں مذکورہ "فلم شو" دکھایا۔

میں سنٹر میں پہنچا تو ایک روسی افسر نے "السلام علیکم" کہہ کر استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا نام (Bolat K. Nurgaleyev) ہے۔ "فلم شو" میں تصویروں اور آوازوں کے ذریعہ روس کے مسلم علاقہ (سنٹرل ایشیا) کو دکھایا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ کی فلم میں "مسلم روس" کا مکمل تعارف سامنے آگیا۔ اسلامی دور کے آثار، موجودہ اسلامی سرگرمیاں، روسی مسلمانوں کے رہن سہن کا طریقہ، غرض ہر چیز کامیاب تصویروں کے ذریعہ اس طرح دکھائی گئی کہ کچھ عرصہ کے لئے محسوس ہوا کہ ہم دہلی میں نہیں ہیں، بلکہ سنٹرل ایشیا میں گھوم رہے ہیں اور سارے مناظر کو براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"فلم شو" کو دیکھنے کے بعد جب ہم واپس آنے کے لئے لفٹ کے دروازہ پر پہنچے تو سنٹر کے روسی ڈائرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا " اب تو روس جا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں "۔ ان کے اس جملہ میں دراصل ان کا یہ احساس فخر جھلک رہا تھا کہ جو چیزیں آپ آئندہ روس میں جا کر دیکھیں گے، اس کو ہم نے کامیاب

"فلم شو" کی صورت میں آپ کو یہیں دکھا دیا ہے۔

اس "فلم شو" کو دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ قرآن میں جنت کے بارہ میں کہا گیا کہ و اُتوا بہ متشابھا (البقرہ ۲۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزیں آخرت کی چیزوں کا تمثیلی تعارف ہیں۔ اسی کا ایک نمونہ یہ "فلم شو" بھی ہے۔ جدید تکنیک نے اس کو ممکن بنا دیا کہ "مسلم روس" کو واضح تصویروں کی صورت میں دہلی کے اندر پیشگی طور پر دیکھا جا سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں موت سے پہلے کی دنیا میں موت کے بعد والی دنیا کو پیشگی طور پر تمثیل کے روپ میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۰ کی شام کو روانگی ہوئی۔ دفتر سے نکل کر گاڑی پر بیٹھا تو دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی: خدایا خیریت کے ساتھ لے جائیے اور خیریت کے ساتھ واپس لائیے۔ دنیا اور آخرت میں خیریت کا معاملہ فرمائیے۔

دہلی میں میں ۱۹۶۷ سے ہوں۔ یہاں کی مانوس سڑکوں سے گزرتے ہوئے جب میں ایرپورٹ کی طرف جا رہا تھا تو خیال آیا کہ زندگی نام ہے مانوس راہوں میں نامانوس سفر طے کرنے کا۔ خارجی ظواہر میں اندرونی حقائق کو پالینے کا۔ جو لوگ صرف دیکھے کو جانیں انھوں نے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اَن دیکھے کو پالیں وہی دراصل وہ لوگ ہیں جن کو جاننے والا کہا جائے۔

قرآن کے مطابق، حیات دنیا کا ایک ظاہر ہے اور اسی کے ساتھ حیات دنیا کا ایک باطن ہے (الروم ۷) ایک مفسر نے اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ انھوں نے چھلکے کو جانا اور وہ مغز کو نہ جان سکے (انہم عرفوا القشور ولم یعرفوا اللباب) دنیا کے دکھائی دینے والے مناظر میں اللہ تعالیٰ نے نہ دکھائی دینے والی آخرت کی نشانیاں چھپا دی ہیں۔ وہی لوگ حقیقۃً آنکھ والے ہیں جنھوں نے دکھائی دینے والی دنیا میں نہ دکھائی دینے والی آخرت کا مشاہدہ کر لیا۔

مغرب اور عشاء کی نماز ایرپورٹ پر وی آئی پی لاونج میں پڑھی۔ لاونج کے باہر دہلی کا موسم گرم تھا۔ مگر لاونج کے اندر مجھے سوئٹر پہننا پڑا۔ ایرکنڈیشنگ کے ذریعہ مصنوعی طور پر موسم کو بدل لینا بظاہر اچھی بات ہے۔ مگر یہ سہولت آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ "نیچر" سے بے تعلق ہو جائے۔ اس کو انسانی مصنوعات کی خبر ہو، مگر خدائی مصنوعات اس کے لئے لامعلوم چیز بن جائیں۔

دہلی سے ایروفلاٹ کی پرواز ۵۳۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں ہر چیز کا معیار یورپ کی اچھی ہوائی کمپنیوں سے کم نظر آیا۔ اشتراکی روس نے جنگی صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ توجہ دی۔ مگر انسان کے وسائل محدود ہیں۔ ایک شعبہ میں بہت زیادہ آگے بڑھنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شعبوں میں پیچھے رہ جائے۔ یہی روس کے ساتھ ہوا۔ جنگی صنعت میں تقدم کا نتیجہ اس کے لئے غیر جنگی شعبوں میں تخلف کی صورت میں برآمد ہوا۔ گورباچوف کا پرویسترائیکا (re-structuring) روسی زندگی میں اسی عدم توازن کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جہاز میں ایروفلاٹ کا میگزین "سوویت ایرلائنز" موجود تھا۔ ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سیکڑوں روسی ہوابازوں میں سے پانچ کو ہیروازم اور ہمت (courage) کی بنا پر خصوصی انعام دیا گیا۔ ناموں سے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک مسلمان ہواباز تھے۔ ان کا نام میجر رشید بتایا گیا تھا۔ ان کا جہاز فضا میں سخت حالات کا شکار ہو گیا۔ مگر انھوں نے غیر معمولی محنت اور مہارت سے کام لے کر جہاز کو اور اس کے مسافروں کو بچالیا۔ مگر جب ان کا جہاز زمین پر اترا تو ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی سیٹ سے اپنے آپ نہیں اٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے جہاز کو بچانے کے لئے اپنی ساری طاقت خرچ کر دی تھی:

But when the plane came to a standstill he could not leave the cabin by himself. He had no strength left (p.3).

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مسلمان یہاں کی اعلیٰ سروسوں میں ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی کارکردگی سے نمایاں درجہ حاصل کر لیا ہے۔

درمیان میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے تاشقند میں رکا۔ لینڈنگ اتنی اچھی تھی کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ اڑ رہا تھا اور کب زمین پر اتر گیا۔ اکثر مسافر تاشقند ایرپورٹ دیکھنے کے لئے اترے۔ میں بھی اترا۔ یورپی معیار کے لحاظ سے ہوائی اڈہ کم تر معیار کا تھا۔ "ٹرانزٹ پاس" سے لے کر کرسیوں اور ٹوائلٹ تک ہر چیز نسبتاً معمولی تھی۔

ہوائی اڈہ موجودہ زمانہ میں قوموں کی ترقی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ روس کی موجودہ تبدیلیاں گویا فطرت انسانی کی چیخ ہیں۔ ستر برس کے ناکام تجربہ کے بعد

یہاں کے انسان کی فطرت چیخ اٹھی کہ ہم کب تک مارکس کے مصنوعی نظام کا بوجھ اپنے اوپر لادے رہیں جس نے ہمیں دنیا کی قوموں سے پیچھے کر دیا۔

تاشقند ازبیک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ اس کی تاریخ دوسری صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ازبیک زبان میں تاشقند کے معنی "پتھر کا گاؤں" ہیں۔ مگر آج وہ ماسکو، لینن گراڈ اور خیف کے بعد سوویت یونین کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ عربوں نے اس شہر کو آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا۔ تیرھویں صدی میں اس پر منگولوں نے قبضہ کر لیا۔ مگر منگولوں کے قبول اسلام کے بعد وہ بدستور مسلم سلطنت کا ایک جزء رہا۔ ۱۹۱۷ سے اس پر کیمونسٹ روس کا قبضہ ہے۔ سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری نے اسی مقام پر پاکستان کے ساتھ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ کو "تاشقند معاہدہ" پر دستخط کئے تھے جس کے اگلے دن حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔

تاشقند ہی میں قرآن کا وہ نسخہ موجود ہے جس کو مصحف عثمان کہا جاتا ہے۔ خلیفہ سوم عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے پانچ مکمل نسخے تیار کرائے۔ اس کے بعد مکہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق میں ایک ایک نسخہ رکھوایا، اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہی عثمانی نسخہ پہلی صدی ہجری میں سمرقند پہنچا۔ پھر ۱۸۶۹ء میں اس کو قیصر روس نے حاصل کیا اور اس کو پیٹرس برگ کی سرکاری لائبریری میں محفوظ کر دیا۔ تاہم اس سلسلہ میں دوسری روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تیمور نے جب دمشق پر قبضہ کیا تو وہاں سے اس نے مصحف عثمان کو حاصل کیا اور اس کو اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ امین الخولی مصری جامعۃ الازہر کے استاد تھے۔ ان کی ایک عربی کتاب ہے جس کا نام ہے: الارتباطات بین النیل والفولغا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ مصحف عثمانی کس طرح تاشقند پہنچا۔ تاہم انھوں نے مختلف روایات کو جمع کر دیا ہے۔ کسی ایک روایت کو انھوں نے ترجیح نہیں دی۔

اس علاقہ کے مسلمان اول روز سے یہ چاہتے تھے کہ حکومت روس یہ مصحف ان کے حوالے کر دے۔ مگر قدیم دور میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ مشورہ کیا اور ایک وفد اس سلسلہ میں لینن کے پاس بھیجا گیا۔ لینن نے مسلم وفد کی بات سننے کے بعد اس سے اتفاق کیا اور اسی وقت حکومت کے متعلقہ ذمہ دار کے نام مصحف کی واپسی کے

لئے ایک خط لکھا جس پر ۹ دسمبر ۱۷۹۱ کی تاریخ درج تھی۔ اس خط کا عربی ترجمہ میں نے المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان بابا خان کی عربی کتاب الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیۃ میں دیکھا ہے (صفحہ ۸۶ – ۸۷)

اس مصحف کے کچھ صفحات ضائع ہو گئے ہیں۔ موجودہ مصحف میں کل ۳۵۲ صفحات ہیں۔ ۱۹۲۳ تک وہ شہر اوفا میں تھا۔ ۱۹۲۳ میں اس کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سمرقند لایا گیا اور شہر کی جامع مسجد خوجہ احرار میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۳ سے وہ ایک میوزیم میں ہے جو خاص اسی کے نام پر بنایا گیا ہے۔

تاشقند اس سوویت خطہ میں واقع ہے جس کو سنٹرل ایشیا کہا جاتا ہے۔ روس کے مشہور عالم المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان بابا خان نے اپنی ۲۸۵ صفحہ کی کتاب (الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیہ) میں بتایا ہے کہ اسلام یہاں سب سے پہلے آذربائیجان اور داغستان میں پہنچا۔ یہ خلیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ساتویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد اسلام پورے سنٹرل ایشیا میں پھیل گیا جو اس زمانہ میں ماوراء النہر کہا جاتا تھا۔ خلفاء بنی امیہ نے اس علاقے میں کثرت سے ایسے مسلمان بھیجے جو یہاں اسلام کی اشاعت کریں اور لوگوں کو قرآن اور عربی زبان کی تعلیم دیں۔ انھیں میں سے ایک قثم بن عباس بن عبد المطلب بھی تھے جن کی قبر آج بھی سمرقند میں موجود ہے۔ دسویں صدی عیسوی تک اس علاقہ کے قبائل بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کر چکے تھے۔

سنٹرل ایشیا سے اسلام کی زبردست تاریخ وابستہ ہے۔ اس علاقہ سے اسلام کی نہایت ممتاز اسلامی شخصیتیں اٹھیں۔ مثلاً محمد بن اسماعیل البخاری، محمود الزمخشری، ابو نصر الفارابی، ابو علی بن سینا، ابو عیسیٰ الترمذی، وغیرہ۔

۲۹ جولائی کی صبح کو ہمارا جہاز ماسکو ایئرپورٹ پر اترا۔ لینڈنگ حیرت انگیز حد تک "اسموتھ" تھی۔ جہاز کی خاتون اناؤنسر نے جب اعلان کیا کہ "اب آپ ماسکو میں ہیں" تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اسی طرح ایک روز خدا کے فرشتے مجھے ایک سفر کرائیں گے اور منزل پر پہنچ کر اعلان کریں گے کہ "اب تم عالم آخرت میں ہو"۔ ماسکو بھی میرے لئے ایک نئی دنیا ہے اور آخرت بھی میرے لئے نئی

دنیا ہوگی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ "ماسکو" میرے سفرحیات کی صرف درمیانی منزل ہے، جب کہ "آخرت" میرے سفرحیات کی آخری منزل ہوگی۔ ماسکو ہوائی اڈہ پر تو میرے استقبال کے لئے حکومت کے نمائندے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں میرے سفر کے لئے گاڑی موجود ہے اور قیام کے لئے ہوٹل کا کمرہ پیشگی طور پر رزرو کر دیا گیا ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں میرے اوپر کیا بیتے گی، اس کو احکم الحاکمین کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔

ماسکو کا ہوائی اڈہ تاشقند کے ہوائی اڈہ سے بہتر تھا۔ مگر جدید معیار جو جدہ، روم، فرینکفرٹ جنیوا وغیرہ میں نظر آتا ہے، اس کے لحاظ سے اس کو صرف دوسرے درجہ کا کہا جا سکتا ہے۔ ہوائی اڈہ کی ہر چیز اعلیٰ معیار سے کم تر تھی۔ سوویت روس نے جنگی طاقت میں امریکہ کی برابری (parity) حاصل کر لی ہے۔ مگر اس کی قیمت اس کو یہ دینی پڑی کہ وہ دوسری چیزوں میں غیر برابر ہو کر رہ گیا۔ یہ سوویت روس کو مارکسزم کا تحفہ ہے۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کا راستہ تقریباً پون گھنٹہ کا تھا۔ مسٹر الکسی گالکن (Alexei Galkin) بطور گائڈ ساتھ تھے۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں کہر بھی تھا۔ اس لئے اطراف کے مناظر بہت زیادہ صاف نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم ایک چیز نمایاں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جو عمارتیں نظر آئیں وہ زیادہ تر کثیر منزلہ تھیں۔ اگر آپ دبئی ایرپورٹ سے شارجہ کی طرف جائیں تو آپ کو وہاں کی بیشتر عمارتیں یک منزلہ یا دو منزلہ دکھائی دیں گی۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں کثیر منزلہ تھیں۔ اس فرق کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وہاں کے لوگ افقی ترقی (horizontal growth) پر یقین رکھتے ہیں اور یہاں کے لوگ عمودی ترقی (vertical growth) پر۔

ماسکو میں میرا قیام جس ہوٹل میں تھا اس کا نام ازمائیلوف (Izmailovo) تھا۔ یہ ۲۸ منزلہ ہے۔ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۹-۱۰ میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کمرہ کافی اچھا تھا۔ تاہم اس کمرہ کی سب سے ممتاز چیز وہ تھی جس کو میں استعمال نہ کر سکا۔ اور وہ ٹی وی سیٹ تھا۔ بظاہر اس کی کوالٹی اچھی تھی۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں میں بہت بے ذوق واقع ہوا ہوں۔ کمرہ میں ٹی وی کا خصوصی اہتمام یہاں کے نظام کی علامت تھا۔ کیوں کہ کمیونسٹ نظام کے تحت سوویت روس میں اسلحہ کی تیاری کے بعد دوسری جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی وہ پبلسٹی تھی۔ (باقی)

۱ جناب کے کلیم الدین صاحب نیویارک (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ وہ وہاں منظم انداز میں الرسالہ کے مشن کو پھیلا رہے ہیں۔ الرسالہ انگریزی اور انگریزی کتابوں کے علاوہ اردو کتابوں کو بھی انھوں نے اس کا ذریعہ بنایا ہے۔ امریکہ میں ان سے حسب ذیل ٹیلیفون نمبر پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے ـــــ (718)258 3435

۲ ویٹیکن کی طرف سے اٹلی (باری) میں ایک عالمی امن کانفرنس ۲۵ - ۲۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ اس کا دعوت نامہ صدر اسلامی مرکز کے نام آیا تھا۔ مگر آخر وقت میں بعض اسباب پیش آنے کی وجہ سے سفر نہ ہو سکا۔ تاہم ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے مرکز کے نمائندہ کے طور پر باری اور روم کا سفر کیا اور وہاں "امن اور اسلام" کے موضوع پر ایک انگریزی مقالہ پیش کیا۔

۳ امریکی میگزین ٹائم کی اسپیشل کرسپانڈنٹ انیتا پرتاپ ۶ ستمبر ۱۹۹۰ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع "عورت کا درجہ اسلام میں" تھا۔ انٹرویو کے خاتمہ پر انھیں ایک قرآن مجید (انگریزی ترجمہ کے ساتھ) اور انگریزی الرسالہ دیا گیا۔

۴ منسٹری آف ویلفر کی طرف سے نئی دہلی (پارلی منٹ ہاؤس) میں ایک نیشنل کانفرنس ۱۱ اگست ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ اس میں اقلیت کے لیڈروں اور انٹلکچول افراد کو بلایا گیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ بعض اسباب سے وہ اس موقع پر شرکت نہ کر سکے۔ البتہ موضوع بحث سے تعلق رکھنے والا کچھ انگریزی لٹریچر انھیں بھیج دیا گیا۔

۵ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے "الاسلام" کا مطالعہ کیا، ایسی کتاب اسی شخص کے قلم کا نتیجہ ہو سکتی ہے جس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بے پایاں درد ہو اور جو اسلام کو نافذ و سربلند دیکھنے کا بے حد متمنی ہو، وہ ہر عامل اور ہر سبب پر غور کرتا رہتا ہو کہ آخر وہ کونسی کمی ہے کہ اسلام نافذ و غالب نہیں ہو پا رہا ہے اور پھر وہ اس کمی کی گرفت کر لیتا ہے اور پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ اسلام کے دعویداروں کو باخبر کر دیتا ہے۔
اے خدا کے نیک بندے ہم گواہ ہیں کہ تو نے حق تبلیغ ادا کر دیا (بدر جمال اصلاحی، سرائمیر)

۶ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس سلسلہ میں اپنا ایک واقعہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۳ جولائی ۱۹۹۰ کو ہمارے یہاں میرے پوتے کا عقیقہ اور سالگرہ تھا۔ گیٹ پر اور دروازہ پر غبارے لگائے گئے تھے۔ محلہ کے بچوں نے دھوم مچا رکھی تھی اور چند بچے شرارت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان غباروں پر پتھر مار رہے تھے۔ میں نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ ان بچوں سے سختی سے نمٹا جائے۔ لیکن اچانک الرسالہ کی نصیحت یاد آئی۔ میں نے چوکیدار کو واپس بلایا اور خود گیٹ پر جاکر بچوں میں چند غبارے تقسیم کر دئے۔ وہ بچے بے حد خوش ہوئے اور واپس چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ ہر گھر میں پڑھا جانا چاہئے۔ انشاء اللہ اپنے حلقہ میں اس کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کروں گا (احمد عبد الجبار کراچی)

۷ ایک صاحب لکھتے ہیں: ہمارے شہر اورنگ آباد میں مکتبہ اسلامی کے یہاں الرسالہ کی ایجنسی تھی۔ جن سے ہم ہر ماہ الرسالہ لیا کرتے تھے۔ اگست ۱۹۹۰ کے الرسالہ کی ہم نے ان سے مانگ کی تو معلوم ہوا کہ الرسالہ انھوں نے منگوانا بند کر دیا ہے۔ جس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مولانا کی ہماری جماعت سے کھلی دشمنی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ان کے الرسالہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ان کی اس تنگ نظری اور نازیبا حرکت پر الرسالہ پڑھنے والوں میں کافی غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ جس کا تبادل ذریعہ ہمارے نزدیک یہ طے ہوا کہ ہم خود الرسالہ کی ایجنسی لے لیں۔ لہٰذا گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ الرسالہ کی ۲۰ کاپیاں ہمارے پتہ پر روانہ کریں (حاجی عارف خاں، اورنگ آباد)

۸ مولانا محمد یوسف ندوی بھوپال سے لکھتے ہیں: ہندی الرسالہ کی خبر الرسالہ کے قارئین کے لئے انتہائی خوش کن ہے۔ مولانا حمید اللہ ندوی ہندی الرسالہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔ الحمد للہ ایک درجن سے زیادہ لوگوں نے ہر ماہ پانچ الرسالہ لینے کا عہد کیا ہے۔ یہ حضرات ہر ماہ پانچ الرسالہ ہندی خرید کر اپنے غیر مسلم دوستوں میں تقسیم کریں گے۔ یہاں عام تأثر یہ ہے کہ ہندی الرسالہ انشاء اللہ غیر مسلموں میں صحیح اسلام کے تعارف اور غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ بنے گا۔

۹ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ہانگ کانگ گئے۔ وہاں ۷ اگست ۱۹۹۰ کو انھوں نے مقامی جامع مسجد

میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ایک صاحب ان سے ملے اور الرسالہ کی بات شروع کر دی۔ ڈاکٹر صدیقی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ الرسالہ ہانگ کانگ میں بھی پہنچا ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ آج الرسالہ دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ رہا ہے۔

۱۰ سید لیاقت علی صاحب (ناگپور) نے بتایا کہ وہ آفسٹ پرنٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ لوگ اکثر اسلام کے بارہ میں انگریزی کتابیں مانگتے ہیں۔ لیاقت علی صاحب نے کہا کہ ان لوگوں کو دینے کے لئے سب سے زیادہ موزوں کتابیں اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں ہیں۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو یہ کتابیں دیتا رہتا ہوں۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ ہیں جو اس انداز پر کام کر رہے ہیں۔

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: ایک دوست کی دکان پر الرسالہ اردو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کافی متاثر ہوا۔ فوراً اس کا سالانہ خریدار بن گیا۔ باقاعدگی سے اس کو پڑھ رہا ہوں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کے لئے دیتا ہوں۔ فائل بھی بنائی ہے پرچہ کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ تبلیغی و دعوتی کام کو آپ بہت اچھی طرح انجام دے رہے ہیں (سراج الدین بلساری، بمبئی)

۱۲ ایک صاحب لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص اس مصروف اور مشینی زندگی میں صرف ایک رسالہ پڑھنا چاہے تو اس کو الرسالہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ وہ کون سا شعبہ ہے جو الرسالہ میں نہیں۔ اسلامیات تاریخ، جغرافیہ، ادب، فلسفہ، منطق، عام معلومات، غرض الرسالہ ہر موضوع کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش اور موثر کہ پڑھتے ہی دل میں اتر جائے۔ الرسالہ واقعی روح کی غذا ہے یہ واحد رسالہ ہے جو اسلام کو موجودہ سائنٹفک اسلوب اور موثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔ (مناظر حسن شاہین، گیا)

۱۳ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں: آپ کی کتاب "اللہ اکبر" پڑھ کر بہت ہی طبیعت کو سرور حاصل ہوا۔ اور ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو دل چاہتا ہے کہ میں اس کا انگریزی ترجمہ کروں۔ تاکہ مغربی دنیا کی مادی زندگی کو اس کا شعور دلایا جائے۔ اس سلسلہ میں میں کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ محض ایک فرض ادا کرنا چاہتا ہوں (محمد عبد الجلیل، کراچی)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسؤل نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

RN 50760/90 □ Rs. 5

Gifting the Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a GIFT of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: ________________

Address: ________________

Please tick box where applicable

□ Urdu □ 1 year □ Air-mail
□ English □ 2 years □ Surface-mail
□ Hindi □ 3 years
□ 5 years

□ Please send a publications catalogue

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. ________

Subscription Rates

	INLAND	ABROAD	
		AIR-MAIL	SURFACE-MAIL
1 year	Rs 60	Rs 350/$25	Rs 170/$10
2 years	Rs 110	Rs 650/$40	Rs 300/$18
3 years	Rs 150	Rs 900/$55	Rs 425/$25
5 years	Rs 240	Rs 1400/$85	Rs 650/$40

Pakistan Rs 125 for one year

Annual Supporting Subscription

INLAND .... Rs 300

ABROAD (By Air-mail) $100

Please send this together with the payment of the Circulation Manager.

AL-RISALA, The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

RNI 28822/76 □ February 1991 No. 171 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	55/-
صراطِ مستقیم	35/-
خاتونِ اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہِ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	15/-
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیرِ ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیاتِ اسلام	30/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیاتِ طیبہ	5/-
باغِ جنت	5/-
نارِ جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنتِ رسولؐ	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-
इन्सान! अपने आपको पहचान	3/
सच्चाई की तलाश	5/
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/-

U(SE)12/86

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳